ماہنامہ
طلوعِ اسلام
قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر
لاہور
نومبر 2012ء

فہمِ قرآن کے لئے محترم پرویز کا موقف

محترم پرویز صاحب کا اپنی لغات القرآن کا دفاع

ہماری پیشوائیت نے محترم پرویز کی تصنیف لغات القرآن کے حوالے سے لوگوں میں یہ تاثر دیا ہے کہ جو معانی اس لغت میں دیئے گئے ہیں وہ قرآن کریم کے ان تراجم سے مختلف ہیں جو ہمارے ہاں عام طور پر مروج ہیں۔ اس بنا پر ان پر یکطرفہ طور پر ان کا موقف جانے بغیر کفر کا فتویٰ بھی صادر کیا گیا اور ان کے پیغام کو لوگوں تک پہنچنے سے روکنے کے لئے مذہبی نمائندے ہر جائز و ناجائز حربے آزمانے میں ابھی تک مصروف ہیں۔ انصاف کا تقاضہ یہی ہے کہ فیصلہ کرنے سے پہلے محترم پرویز صاحب کے موقف کو بھی سامنے رکھا جائے جو انہوں نے خود زیرِ تبصرہ کتاب کے پیش لفظ میں یوں بیان کیا ہے۔

ہم نے ہر لفظ کے لغوی معانی کی سند میں اس کتاب کا حوالہ دے دیا ہے جہاں سے وہ معانی لئے گئے ہیں اور ارباب علم کے نزدیک ان کی حیثیت مستند ہے۔ ان کتابوں میں البتہ بعض اوقات ان کے مولفین نے (لغوی معانی کے علاوہ) قرآنی تعلیم کے بارے میں خود اپنی رائے بھی دی ہے۔ ہم نے بعض مقامات پر (لغوی معانی سے نہیں) ان آراء سے اختلاف کیا ہے۔ محترم پرویز صاحب کا اور علمی معیار کا بھی موقف یہی ہے کہ اشخاص کی آراء (جن میں محترم پرویز کی اختلافی آراء بھی شامل ہیں) ان کی ذاتی استعداد، رجحانات و میلانات' نیز خود اس زمانے کی علمی سطح اور عام فضا کا نتیجہ ہوتی ہیں جس میں وہ تربیت پاتے ہیں۔ اس لئے دوسروں پر ان آراء کی پابندی لازم نہیں ہوتی اور نہ علمی روش اور قرآن کی تعلیم سے مطابقت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کا اعتراض خود ہمارے ملک کے مروجہ قانون کے بھی خلاف ہے۔

پاکستان کی سپریم کورٹ نے ایک فیصلہ صادر فرمایا جو (P.L.D) کی اشاعت بابت اگست 1980ء میں شائع ہوا۔ اس میں ریٹائرڈ جسٹس محمد شفیع کے ایک فیصلے کا اقتباس بھی دیا گیا ہے' جس میں انہوں نے کہا تھا کہ یہ حقیقت واضح ہے کہ قرآن کریم کا پڑھنا اور سمجھنا کسی ایک یا دو افراد کی اجارہ داری نہیں۔ اسے آسان اور قابل فہم زبان میں نازل کیا گیا تھا تا کہ جو مسلمان بھی کوشش کریں اسے سمجھ سکیں اور اس پر عمل بھی کر سکیں۔ اس سے ثابت ہے کہ قرآن کے پڑھنے اور سمجھنے کا حق ہر مسلمان کو دیا گیا ہے' جسے کوئی شخص' خواہ وہ کتنے ہی بلند منصب پر فائز اور صاحب علم کیوں نہ ہو' اس سے چھین نہیں سکتا۔ قرآن کے سمجھنے کے لئے متقدمین کی تفسیروں سے صرف استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کی تعبیر میں انہیں حرف آخر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ قرآن کے پڑھنے اور سمجھنے سے مراد اس کی تعبیر ہے اور تعبیر سے مقصود یہ ہے کہ اس کے احکام کو حالات حاضرہ کے تقاضوں اور دنیا کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کی روشنی میں نافذ کیا جائے۔ اگر ان مفسرین کی تعبیرات کو جو بارہ تیرہ سو سال پہلے ہو گذرے ہیں'

حرف آخر سمجھ لیا جائے تو تمام مسلم معاشرہ ایک فولادی پنجرے میں محبوس ہو جائے گا اور اسے اس کی اجازت ہی نہیں ہوگی کہ وہ زمانے کے ساتھ نشوونما پا سکے۔ اس سے اسلام ایک عالمگیر دینی نظام ہونے کے بجائے ایک ایسا مذہب بن کر رہ جائے گا جو اسی زمانے تک محدود رہے گا جس میں وہ نازل ہوا تھا۔''

محترم پرویز صاحب نے زیر تبصرہ کتاب میں قرآن کریم کے معانی متعین کرنے کا یہ طریق اختیار کیا ہے۔

(الف) سب سے پہلے متعلقہ لفظ کے مادہ کو دیکھا جائے کہ اس کا بنیادی مفہوم کیا ہے اور خصوصیت کیا۔ اس مادہ کی شکلیں کتنی ہی کیوں نہ بدلیں' اس کی خصوصیت کی روح بالعموم ہر پیکر میں جھلکتی رہے گی۔

(ب) اس کے بعد دیکھا جائے کہ صحرانشین عربوں کے ہاں اس لفظ کا استعمال کس کس انداز سے ہوتا تھا۔ ان کے استعمال کی محسوس مثالوں سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ ان کے ہاں اس مادہ کا تصور (Concept) کیا تھا۔ واضح رہے کہ جب تک تصورات (Concept) کا تعین نہ کیا جائے' الفاظ کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ یہ وہ بنیادی اصول ہے جس پر دور حاضرہ میں (Semantics) نے بڑی عمدہ روشنی ڈالی ہے۔ علم اللسان کے اس شعبہ کا مطالعہ' الفاظ کی روح تک پہنچنے میں بڑا ممد ومعاون ثابت ہوتا ہے۔

(ج) اس کے بعد یہ دیکھنا چاہئے کہ قرآن کریم میں وہ لفظ کس کس مقام پر آیا ہے اور اس نے اسے کس کس رنگ میں استعمال کیا ہے۔ ان مقامات سے اس لفظ کا قرآنی تصور (Quranic Concept) سامنے آجائے گا۔

(د) سب سے بڑی چیز یہ کہ قرآن کریم کی پوری تعلیم کا مجموعی تصور سامنے ہونا چاہئے اور اس بنیادی اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اس کے مفردات اور اصطلاحات کا مفہوم اس کی مجموعی تعلیم کے خلاف نہ جائے۔ اس لئے کہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ ذہن کو خارجی اثرات سے الگ رکھ کر قرآن کا مطالعہ خود قرآن کی روشنی میں کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو نور (روشنی) کہا ہے اور روشنی اپنے آپ کو دکھانے کے لئے خارجی مدد کی محتاج نہیں ہوتی۔''

اس طریق کی تائید میں انہوں نے درج ذیل دو مفکرین کی آراء کو بھی پیش کیا ہے۔

(1) علامہ اقبال کا بیان کہ قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریف آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) شیخ محمد عبدہ کا تفسیر المنار کے مقدمہ میں قرآن کے صحیح معانی معین کرنے کے بارے میں موقف کہ کسی لفظ کے خاص معنی کو ترجیح دینے کے لئے قانون یہ ہوگا کہ وہ معنی سابقہ عبارت سے مطابقت اور موافقت رکھتے ہوں۔ پورے موضوع ومطالب سے اتفاق رکھتے ہوں اور قرآن کے مجموعی مقصد سے ہم آہنگ ہوں۔

لہٰذا متقدمین سے اختلاف کرنے پر کسی کو مورد عتاب ٹھہرانا بلاجواز ہے۔

☆☆☆

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

فہرست

لمعات: ملالہ ...... علم وآگہی کا روشن حوالہ	ادارہ	3
بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو	اِقبالؒ	4
پرویز صاحب کا نظریہٴ تاریخِ اسلام	منظور حسین لیل	6
بگ بینگ سنگولیرٹی اور قرآن	راجہ عبدالعزیز خان (دھیرکوٹ آزاد کشمیر)	17
قرآن اور شاعری	غلام احمد پرویز	30
اقامتِ دین کی قرآنی اساس اور اس کے ثمرات	خواجہ ازہر عباس	34
ایک مختلف جمہوری نظام	ڈاکٹر عطاء الرحمٰن	42
آپ کے خطوط		45
مومن کسے کہتے ہیں	عارف محمود کسانہ سویڈن	47

ENGLISH SECTION

Surah Al-Mulk Durus-al-Qur'an Parah 29: Chapter 3	By G. A. Parwez (Translated by: Dr. Mansoor Alam)	49

طلوعِ اسلام کا لٹریچر یہاں سے دستیاب ہے

نیچے درج کئے گئے کتب خانوں سے طلوع اسلام ٹرسٹ کی تمام کتب' دروس القرآن کی تمام جلدیں' اسلامی کتابیں اور لائبریری کے لئے تمام موضوعات پر ہمہ قسم کتب رعایتی نرخوں پر خریدنے کے لئے تشریف لائیں۔

1- کلاسک بُک سیلرز' 42 دی مال (ریگل چوک)' لاہور۔	فون: 042-37312977' موبائل: 0300-4442226
2- البلال بُک ڈپو' اردو بازار' کراچی۔ موبائل: 0344-2502141	3- شہباز بُک ایجنسی' اردو بازار' کراچی۔ فون: 021-32632664
4- مذہبی کتب خانہ' اردو بازار' کراچی۔ موبائل: 0331-2716587	5- شاہ زیب انٹر پرائزز' اردو بازار' کراچی۔ فون: 021-32214259
6- علمی کتاب گھر' اردو بازار' کراچی۔ فون: 021-32628939	7- مکتبہ دارالسلام' اردو بازار' کراچی۔ فون: 021-32212269
8- مکتبہٴ دارالقرآن' اردو بازار' کراچی۔	9- محمد علی' کارخانہ اسلامی کتب' اردو بازار' کراچی۔ فون: 021-32631056
10- ایوانِ کتب' اردو بازار لاہور' فون: 0321-8836932	

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادارہ

لمعات

ملالہ ...... علم و آگہی کا روشن حوالہ

''میں سوات کی ایک دُکھوں کی ماری لڑکی ہوں۔ سوات جو کبھی سرسبز کھیتوں میں گھری ایک پُرامن زمین تھی، جس پر ہوا مہربان تھی۔ یہ پھولوں کی سرزمین تھی جہاں دُنیا بھر سے سیاح آیا کرتے تھے، یہ وادیٔ مشرق کا سوئٹزرلینڈ کہلاتی تھی۔''

''مگر اب یہ ماضی کا قِصّہ ہے۔ اب یہاں لاقانونیت، خوف اور تشدد کا دور دورہ ہے۔ یہاں تک کہ لوگ اپنے بچوں کو پولیو کے ٹیکے نہیں لگوا سکتے اور لڑکیاں اپنے اسکول جانے کے حق سے محروم کر دی گئی ہیں .... ہمارے سکولوں کو دھماکوں سے اُڑا دیا گیا ستم بالائے ستم یہ کہ انہوں نے لڑکوں کے اسکول بھی اُڑا دیئے۔'' آج سے تین سال پہلے گیارہ سالہ۔ ملالہ نے پریس کلب پشاور میں جرأت مندانہ کہا تھا کہ ''مجھے میرا تعلیم کا حق اللہ اور اس کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے۔ تو پھر یہ لوگ کیوں مجھ سے میرا وہ حق چھیننے کے درپے ہیں جو مجھے میرے اللہ اور اس کے پیغمبر آخر نے عطا کیا ہوا ہے۔''

یہ تھا ملالہ کا مطالبہ! جس کے جواب میں اس کی اسکول بس رُکوا کر ماتھے میں گولی مار دی گئی۔ ذمہ داری تحریک طالبان نے قبول کر لی۔ پاکستان آرمی اور حکومت نے وزیرستان آپریشن کی ٹھانی۔ جبکہ مولانا فضل الرحمٰن نے خبردار کیا کہ ملالہ کے خون پر سیاست کے شیش محل تعمیر نہ کئے جائیں۔ اور قاضی حسین احمد فرماتے ہیں کہ ''میں قاتلانہ حملہ کرنے والوں کو وحشی سمجھتا ہوں لیکن میں جرم کا ذمہ دار اُن لوگوں کو بھی سمجھتا ہوں جنہوں نے اس معصوم بچی کو استعمال کیا تاکہ لوگ حضور نبی اکرمؐ کی توہین پر مبنی فلم کو بھول جائیں۔''

اِس روشنی کے استعارے۔ ملالہ پر قاتلانہ حملے کو ایک چیستان بنا دیا گیا ہے۔ ہر ایک فریق اسے اپنے حق میں استعمال کرنا چاہتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم بڑے آواز اُٹھانے کی بجائے ڈر کے خاموش بیٹھ گئے اور آواز اُٹھانے کی ذمہ داری اس ننھی بچی کے ناتواں کاندھوں پر ڈال دی۔ افسوس! ایک طرف ملالہ کی عمر کے بچوں کو خودکش جیکٹ پہنائے جا رہے ہیں اور دوسری طرف ملالہ جیسی بچی کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ دونوں صورتوں میں نقصان ہماری آنے والی نسلوں کو ہو رہا ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ ملالہ کے مشن کو تیزی سے آگے بڑھایا جائے۔ یعنی ہماری قومی ترجیح تعلیم، تعلیم اور تعلیم ہونی چاہیئے۔ اس نقار خانے میں ایک طوطی نے بجا کہا ہے کہ ہمیں ''تعلیمی ایمرجنسی'' لگانی چاہیئے۔ مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنے گا؟

اِقبالؒ

بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھکو گوارا
اِس دشت سے بہتر ہے نہ دِلّی نہ بخارا
جس سمت میں چاہے صفتِ سیلِ رواں چل
وادی یہ ہماری ہے' وہ صحرا بھی ہمارا
غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دَو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا
حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہُنر کر
کہتے ہیں کہ شیشہ کو بنا سکتے ہیں خارا
افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے مِلّت کے مُقدّر کا ستارا
محروم رہا دولتِ دریا سے وہ غوّاص
کرتا نہیں جو صحبتِ ساحل سے کنارا

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملّت

ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

دنیا کو ہے پھر معرکۂ رُوح و بدن پیش

تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا

اللہ کو پا مردیٔ مومن پہ بھروسا

ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

تقدیرِ اُمم کیا ہے؟ کوئی کہہ نہیں سکتا

مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا

اخلاصِ عمل مانگ نیاگانِ کُہن سے!

'شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا'!

منظور حسین لیل بھکر

پرویز صاحب کا نظریہ ءِ تاریخِ اسلام

گذشتہ سے پیوستہ

حضور کریم ﷺ اور اُن کے صحابہ کرامؓ کے زمانے کی تاریخ کے واقعات کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار قرآن کریم ہے۔ کیونکہ اُن عظیم ہستیوں کے فضائل و کردار کو قرآن کریم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا ہے۔

وہ ریکارڈ کہاں گیا؟:۔ اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ وہ اتنا ذخیرہ بالآخر گیا کہاں؟۔ اس کے متعلق نہ کسی نے کوئی تحقیق کی، نہ اس سوال کا کوئی جواب دیا۔ اُس دور کی پہلی مفصّل تاریخ تیسری صدی میں جا کر مرتب ہوئی اور وہ بھی احادیث کی طرح زبانی روایت کی بناء پر۔ کسی مورخ نے یہ نہیں لکھا کہ میں نے اپنی تاریخ کو اُس دور کی اصل (Original) دستاویزات سے مرتب کیا ہے۔ یہ جو حضور نبی اکرم ﷺ کے دو چار نامہ ءِ مبارک (خطوط) شائع ہوئے ہیں وہ باہر کے علاقوں کے غیر مسلموں کے ہاں سے دستیاب ہوئے ہیں، یہ ہے ہمارے اُس دور کی تاریخ کی حالت! آپ فرمائیے کہ کیا اس کی رو سے اُس دور سے متعلق حتم و یقین کے ساتھ کچھ بھی کہا جا سکتا ہے؟ اس پر عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کے تو یہ معنی ہیں کہ اُس دور کے احوال و کوائف کے متعلق یقینی طور پر کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا!۔ اس اعتراض کا جواب میرے ذمے نہیں۔ میرے متعلق تو آپ صرف یہ دیکھیئے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ حقیقت ہے یا نہیں۔‘‘

صحابہؓ کے فضائل اور کردار:۔ آگے بڑھنے سے پہلے ہمیں صحابہ کرامؓ کے اُن اوصاف، فضائل اور کردار پر ایک نظر ڈال لینا چاہیئے، جنہیں قرآن کریم نے اپنے اندر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا ہے۔ پرویز صاحب اپنی شہرہ ءِ آفاق تصنیف ’’شاہکارِ رسالت‘‘ کے بابِ اوّل، بعنوان ’’گزرگاہِ خیال‘‘ میں رقمطراز ہیں۔ ’’دین کا یہ نظام، عہدِ رسالتمآب ﷺ اور شیخین (حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ) کے زمانہ میں، اس جماعت کے ہاتھوں متشکل ہوا تھا جس کی تعلیم و تربیت خود رسالتمآب ﷺ کے مقدّس ہاتھوں عمل میں آئی تھی اور جنہیں صحابہؓ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ان حضرات کی اس خصوصیتِ کبریٰ کی بناء پر، قرآن کریم نے اس کا تعارف بڑی شرح و بسط سے کرایا ہے۔ انہیں اس نے۔ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ (48:29)۔ ’’رسول اللہ ﷺ کے ساتھی‘‘ کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ اور خود

حضور ﷺ کو ان کا ''صاحب'' (ساتھی) کہہ کر پکارا ہے (۵۳/۲)۔ایک مقام پر حضور ﷺ کے شریکِ غار کو ''صاحبہٖ'' کہا ہے (۹/۴۰)۔حضور ﷺ کے ان ساتھیوں کو عام طور پر ''مومنین'' کہا گیا ہے۔لیکن مزید تعارف کی غرض سے انہیں مہاجرین اور انصار کے گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ان کے علاوہ اُس دور میں اسلام لانے والوں کے ایک اور گروہ کا ذکر بھی قرآن میں آیا ہے جو اعراب (بادیہ نشینوں) پر مشتمل تھا۔اُن کے متعلق کہا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی حیثیت سے، مملکتِ اسلامی کی اطاعت تو قبول کر لی تھی لیکن ''ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اُترا تھا'' (۴۹/۱۴)۔قرآن کریم نے جن ''ناپختہ ایمان والوں'' کا ذکر کیا ہے ان سے یہی لوگ مراد ہیں۔ان کے سوا، باقی تمام وہ مومن تھے جن کے راستے پر چلنے کی تاکید خود قرآن نے کی ہے اور کہا ہے کہ جو لوگ اس راستے کو چھوڑ کر کوئی اور راہ اختیار کریں گے ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا (۴/۱۱۵)۔اس سے ان حضرات (صحابہ کرامؓ) کے مقام کا اندازہ لگ سکتا ہے۔

(۲)۔ان کی اہمیت کے متعلق کہا ہے کہ: **هُوَ الَّذِيٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ** (8:62) خدا وہ ہے جس نے، اے رسول! اپنی نصرت اور جماعتِ مومنین کو تمہاری تائید و تقویت کا موجب بنایا۔آگے چل کر اس کی وضاحت ان الفاظ سے کردی: **يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ** (8:64)۔''اے نبی! (۱) خدا اور (۲) یہ جماعتِ مومنین، جو تیرا اتباع کرتی ہے، تیرے لئے کافی ہے۔'' آپ نے غور فرمایا کہ صحابہؓ کی جماعت کا مقام اس قدر بلند تھا کہ خدا نے انہیں اپنے ساتھ ہم قوس قرار دے کر، یہ کہا ہے کہ یہ دونوں (خدا اور جماعتِ مومنین) حضور ﷺ کے مشن کی کامیابی کے لئے کافی ہیں۔

(۳)۔صحابہؓ کی اس اہمیت کے پیشِ نظر حضورؐ سے کہا گیا کہ ''یہ لوگ جو منشائے خداوندی کو پورا کرنے کے لئے صبح و شام، مسلسل و پیہم۔۔خدا کو پکارتے ہیں، انہیں اپنے قریب رکھو، دھتکارو نہیں (۵۲/۶۔۱۸/۲۸)۔'' **وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ** (26:215;15:88) ان کی اس طرح پرورش اور حفاظت کرو جس طرح مرغی اپنے بچوں کی پرورش اور نگہداشت کرتی ہے۔

(۴)۔جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، یہ جماعت، مہاجرین اور انصار پر مشتمل تھی۔ان کے متعلق فرمایا (یہاں صرف مفہوم پیش کیا جا رہا ہے۔''شاہکارِ رسالت'' میں آیت کا عربی متن بھی دیا گیا ہے۔موءلف)۔''وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور خدا کی راہ میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنہوں نے انہیں پناہ دی اور ان کی مدد کی۔یہ سب کے سب سچے اور پکّے مومن (مومن حقا) ہیں۔ان کے لئے مغفرت ہے اور عزت کا رزق۔'' (۸/۷۴)۔اس آیہء جلیلہ میں اللہ تعالےٰ نے، جملہ مہاجرین اور انصار کو مومنِ حقا کہہ کر پکارا ہے اور ان کی مغفرت اور رزقِ کریم کی ضمانت دی ہے۔اس آسمان کے نیچے، کسی کے ایمان اور مغفرت کی اس سے بڑی شہادت اور کون سی ہو سکتی ہے؟

(۵)۔ان میں کچھ وہ تھے جنہوں نے حضور ﷺ کی دعوت پر سب سے پہلے لبیک کہا اور کچھ وہ جو اُن میں ذرا بعد میں شامل ہوئے۔خدا نے ان سب کے لئے جنّت کی بشارت دی ہے سورۃ توبہ میں ہے: (مفہوم) ’’مہاجرین اور انصار میں سے جنہوں نے سبقت کی اور وہ جو حُسن کارانہ انداز سے ان میں بعد میں شامل ہوئے۔ اللہ اُن سب سے راضی ہو گیا اور وہ اپنے رب سے راضی ہو گئے۔خدا نے اُن کے لئے ایسے باغات (جنت) تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔اُن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔‘‘ (۹/۱۰۰)۔غور فرمایئے! خدا نے تمام صحابہؓ کے لئے، خواہ وہ السابقون الاوّلون کے زمرے میں شریک تھے اور خواہ وہ ان میں بعد میں شامل ہوئے، ابدی جنت کی ضمانت دی ہے اور سب کے لئے ’’رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ‘‘ کا درخشندہ سرٹیفکیٹ عطا فرمایا ہے۔دوسرے مقام پر، ان میں، بعد میں شامل ہونے والوں کے متعلق کہا ہے۔ فَاُولٰٓئِكَ مِنكُمْ (8:75)۔’’وہ بھی تم میں سے ہیں۔جہاں تک خدا کے وعدے کا تعلق ہے، ان میں اور تم میں کوئی فرق نہیں۔‘‘ اس میں شبہ نہیں کہ قرآنی معیار کی رو سے، مدارج کا تعین اعمال کی رو سے ہوتا ہے (۴۶/۱۹) لہٰذا السابقون الاوّلون کے مدارج زیادہ بلند ہوں گے، لیکن جہاں تک جنت و مغفرت کے خدائی وعدہ کا تعلق ہے، وہ ان سب کے لئے یکساں ہے۔چنانچہ سورۃ حدید میں فرمایا:۔(مفہوم) ’’وہ لوگ جنہوں نے فتح مکّہ سے پہلے خدا کی راہ میں مال خرچ کیا اور جنگوں میں شریک ہوئے اور وہ جنہوں نے اس کے بعد ایسا کیا، مدارج کے اعتبار سے یہ دونوں گروہ ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔السابقون الاوّلون کے مدارج بے شک بلند ہیں۔لیکن خدا کے حسین اور خوشگوار وعدے (یعنی جنت اور مغفرت کے وعدے) ان سب کے لئے ہیں۔خدا تم سب کے اعمال سے باخبر ہے (اس لئے اُس نے یہ ضمانت یونہی نہیں دے دی۔‘‘ (۵۷/۱۰)۔

(۶)۔یہ تھی وہ جماعتِ صحابہؓ، رسول اللہ ﷺ کے ساتھی، جن کا تذکرہ اللہ تعالےٰ نے، سورہء الفتح میں ان وجد آور الفاظ میں کیا ہے۔آپ قرآن کریم کے ان حسین و جمیل الفاظ پر غور کیجئے اور پھر ان رفقائے محمد ﷺ کے مقامات و مدارج کا تصور کیجئے۔فرمایا:۔(میں اس آیہء جلیلہ کا مفہوم، اپنے ’’مفہوم القرآن‘‘ سے پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ملاحظہ فرمایئے)۔’’محمد ﷺ اللہ کا رسول اور اُس کے رفقائے کار کی جماعت۔یہ جماعت بھی کیا عجیب و غریب جماعت ہے! ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ حق کے مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت ہیں، لیکن باہمدگر بڑے ہی نرم دل اور ہمدرد (۵/۵۴) تُو انہیں دیکھتا ہے کہ وہ کس طرح ذمے داریوں کا بوجھ اٹھانے کے لئے جھک جاتے ہیں، اور قوانینِ خداوندی کے سامنے پیکرِ تسلیم و رضا بن جاتے ہیں (لیکن یہ تارک الدنیا راہبوں کی جماعت نہیں) یہ، قانونِ خداوندی کے مطابق، سامانِ زیست کی تلاش میں مصروفِ تگ و تاز رہتے ہیں اور اس کے ساتھ اس کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا ہر عمل قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ اور ان کی سیرت، صفاتِ خداوندی سے یک رنگ ہو جائے۔اس سے

اُنہیں جو سکونِ قلب اور حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے، اس کے اثرات ان کے چہروں سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ان کی یہ علامات سابقہ کتبِ آسمانی۔تورات وانجیل۔میں بھی مذکور تھیں۔اُنہوں نے نظامِ خداوندی کو جس طرح قائم کیا اور پروان چڑھایا ہے، اس کی مثال یوں سمجھو کہ جب عمدہ بیج سے شگوفہ پھوٹتا ہے تو اس کی پہلی کونپل بڑی نرم و نازک ہوتی ہے۔پھر جوں جوں اس کی جڑ مضبوط ہوتی جاتی ہے، اس کی نال موٹی ہوتی جاتی ہے۔حتیٰ کہ وہ اتنی مضبوط ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے سہارے آپ محکم اور استوار طریق پر قائم ہو جاتی ہے۔(اس میں خوشے لگتے ہیں اور خوشوں میں دانے پڑ کر سخت اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔یوں وہ ننھا سا بیج پکی ہوئی فصل میں تبدیل ہو جاتا ہے)، جب کاشت کار اپنی محنت کو اس طرح ثمر بار ہوتے دیکھتا ہے تو وجد و مسرت سے جھوم اٹھتا ہے لیکن یہی چیز اس کے مخالفین کے سینے پر سانپ بن کر لوٹنے لگ جاتی ہے۔اسی طرح اللہ، ہر اس جماعت کو جو اس کے قوانین کی صداقت پر ایمان لا کر، اس کے بتائے ہوئے پروگرام پر عمل پیرا ہوتی ہے، اس امر کا وعدہ دیتا ہے (یعنی یہ اس کا قانون ہے) کہ ان کی کوششوں کا ننھا سا بیج، تمام خطرات سے محفوظ رہے گا۔اور ان کی کھیتی پک کر بہترین ثمرات کی حامل ہو جائے گی (۲۴/۵۵)۔لیکن اس کے لئے اس قسم کی محنت اور استقامت کی ضرورت ہوگی، جس قسم کی محنت اور استقامت کا ثبوت کسان دیتا ہے۔(تخمِ صالح، قوانینِ فطرت سے مطابقت، مسلسل محنت اور استقلال و استقامت۔کھیتی کی برومندی کے لئے یہ تمام شرائط لاینفک ہیں)۔۔۔یہ تھے صحابہء رسول اللہ ﷺ، جنہیں خدا نے مومنِ حقا (پکے اور سچے مومن) کہہ کر پکارا۔جنہیں جنت اور مغفرت کی بشارت ہی نہیں دی بلکہ وعدہ کر کے اس کی ضمانت دے دی (کہ خدا کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔۳/۸)۔ان کے متعلق وضاحت کر دی کہ رضی اللہ عنہم و رضوعنہ۔یہ شہادت، ضمانت، صراحت، وعدے اُن سب کے لئے تھے۔ان میں کسی کی استثناء نہیں تھی۔یہ تمام مہاجرین و مجاہدین و انصار کے لئے یکساں تھے۔

تمیزِ مومن و منافق:۔ اس میں شبہ نہیں کہ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) صحرائی قبائل (اعراب) ایسے تھے جن کی تعلیم و تربیت نہیں ہوئی تھی۔اس لئے ''ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا تھا۔'' قرآن کریم میں جن منافقین کا ذکر آتا ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ انہی میں سے ہوں۔لیکن مومنین اور منافقین میں تمیز حضور ﷺ کی زندگی ہی میں ہو چکی تھی۔سورہء آل عمران میں ہے: **مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ** (3:179)۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ خدا اس معاشرہ کو علیٰ حالہٖ رہنے دے۔وہ خبیث و طیب میں تمیز کر کے رہے گا۔اس سے واضح ہے کہ یہ تمیز حضور ﷺ کی زندگی میں ہو چکی تھی۔بہر حال! اتنی بات تو حتمی اور یقینی ہے کہ مہاجرین و انصار، جن سے خدا نے جنت کا وعدہ کیا تھا، آخری دم تک مومنِ حقا رہے تھے کیونکہ جنت کا وعدہ تو خدا انہی سے کر سکتا تھا جو زندگی بھر (اپنے مرنے تک) جنت کے مستحق رہے ہوں۔جو شخص آج مومن ہو اور کل کو (معاذ اللہ) مرتد ہو جائے، اسے خدا جنت کی ضمانت کس طرح دے سکتا ہے؟۔'' اپنی اسی کتاب ''شاہکارِ رسالت'' میں تھوڑا سا آگے چل کر لکھتے ہیں۔''ہم نے

دیکھا ہے کہ قرآن کریم میں صحابہؓ کے متعلق کہا گیا ہے: رُحَمَآءُ بَیۡنَھُمۡ (48:29) وہ آپس میں بڑی محبت اور پیار سے رہتے تھے۔ وہ سب آپس میں بھائی بھائی تھے (۴۹/۱۰) سورہ آلِ عمران میں، جماعتِ صحابہؓ کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے۔ ''تم خدا کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ خدا نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی الفت ڈال دی جس سے تم ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے۔ یہ تم پر خدا کا خاص انعام تھا۔ تم (زمانہ قبل از اسلام میں) جہنم کے گڑھے کے کنارے پہنچ چکے تھے کہ خدا نے تمہیں اس میں گرنے سے بچالیا (۳/۱۰۲)۔'' دوسرے مقام پر ہے:۔ ''خدا نے ان مومنین کے دلوں میں باہمی الفت ڈال دی۔ اے رسول! (یہ باہمی الفت ایسی متاع گراں بہا ہے کہ) اگر تو ساری دنیا کی دولت بھی صرف کر ڈالتا تو یہ بات پیدا نہ ہوسکتی۔ یہ بات خدا ہی سے ممکن تھی۔ وہ قوت اور حکمت دونوں کا مالک ہے (۸/۶۳)۔'' یہ خدا کی شہادت تھی۔

ہماری تاریخ کا بیان:۔ اس کے برعکس، ہماری تاریخ ان کے متعلق کیا کہتی ہے، اس کی بابت آپ کو ذرا آگے چل کر (متنِ کتاب میں) تفصیل سے نظر آئے گا۔ آپ (بالخصوص) تیسرے باب میں دیکھیں گے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے فوری بعد، جب خلیفہ کے انتخاب کے لئے مہاجرین و انصار کا اجتماع ہوا تو اس میں کیا منظر سامنے آیا؟۔ آپ دیکھیں گے کہ اس میں (معاذ اللہ) ایک کی ڈاڑھی تھی اور دوسرے کا ہاتھ، ایک کا خنجر تھا اور دوسرے کا سینہ اور طعن و تشنیع اور سبّ و شتم کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ صحابہؓ کے باہمی تعلقات کا یہ نقشہ ہے جو (رسول اللہ ﷺ کی وفات کے فوری بعد) تاریخ ہمارے سامنے لائی ہے۔۔ ایک قدم اور آگے بڑھیئے! قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ ''کسی مومن کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ دوسرے مومن کو قتل کر دے'' (۴/۹۲)۔ (مفہوم)۔'' جو مومن کسی دوسرے مومن کو بالا رادہ قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے۔ جس میں وہ رہے گا۔ اس پر خدا کا غضب اور اس کی لعنت ہوگی۔ خدا نے اس کے لئے شدید عذاب تیار کر رکھا ہے (۴/۹۳)۔'' آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم کی رو سے، ایک مومن کے قتل عمد کی سزا کیا ہے لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد، جنگِ جمل ہوئی اس میں (بجز معدودے چند) آدھے صحابہؓ ایک طرف تھے اور آدھے دوسری طرف۔ ان میں باہمی جنگ ہوئی جس میں دس ہزار صحابہؓ قتل ہوئے۔۔ دس ہزار مومنین کا قتل، خود مومنین کے ہاتھوں! (عیاذ باللہ)۔ اس سے اگلی جنگ (صفین) میں تاریخ کے بیان کے مطابق ستر ہزار صحابہؓ ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہوئے۔۔ آپ سوچئے کہ (اگر تاریخ کے ان بیانات کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو) قرآن کریم کے مندرجہ بالا فیصلہ کی رو سے، ان میں سے کوئی ایک بھی مستحقِ مغفرت رہتا ہے، حالانکہ یہ سب وہ تھے جن کی مغفرت اور جنت کا وعدہ خود قرآن کریم میں موجود ہے۔۔۔ صاف نظر آتا ہے کہ اس قسم کی روایات اور تاریخی بیانات سب افسانے ہیں، جو خاص سازش کے ماتحت وضع کئے گئے۔۔۔ اس مقام پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ۔۔۔

مودودی صاحب کا نظریہ:۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس اعتراض کو نظری طور پر سامنے لانے کی بجائے ایک عملی مثال سے واضح کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ چند سال ادھر کی بات ہے، سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے ''خلافت وملوکیت'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔اس میں انہوں نے ان روایات کو بہ ہئیتِ مجموعی یکجا کر دیا جن کی بناء پر، غیر مسلم مصنفین، صحابہؓ کرام کی سیرت کو مسخ کر کے پیش کیا کرتے ہیں۔مثال کے طور پر ان میں سے ایک روایت ملاحظہ فرمائیے۔انہوں نے لکھا کہ جب یزید کی فوج نے مدینہ پر حملہ کیا تو:۔ وحشی فوجیوں نے گھروں میں گھس گھس کر بے دریغ عورتوں کی عصمت دری کی۔ حافظ ابن کثیر کہتے ہیں۔حتیٰ قیل انہ حملت الف امراءۃ فی تلک الایام من غیر زوج۔کہا جاتا ہے کہ ان دنوں میں ایک ہزار عورتیں زنا سے حاملہ ہوئیں (خلافت وملوکیت۔ص۔۱۸۲)۔۔۔۔

یہ ۶۳ھ کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔یعنی رسول اللہ ﷺ کی وفات کے صرف پچاس سال بعد کا۔اس وقت ابھی صحابہؓ کی اچھی خاصی تعداد (زندہ) موجود تھی۔اور باقی امت تابعینؒ پر مشتمل تھی۔دوسری طرف یزید کی فوج بھی ''وحشی تاتاریوں'' سے مرتب نہیں ہوئی تھی۔وہ بھی صحابہؓ اور تابعینؒ کے زمرے میں شامل ہونے والے مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ان حقائق کی روشنی میں آپ مندرجہ بالا روایت کو دیکھئے اور سوچئے کہ اس سے مسلمان کس نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ان ''وحشی فوجیوں'' کو تو چھوڑیئے، سوچئے یہ کہ مدینۃ النبی ﷺ کے یہ مسلمان ، اپنی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں، بیویوں کے ساتھ (معاذ اللہ) یہ کچھ بے محابا ہوتے دیکھتے رہے اور کسی کی غیرت جوش میں نہ آئی۔نہ ہی ان خواتین نے، جو خود بھی صحابہؓ نہیں تو تابعینؒ کے زمرے میں شمار ہوتی تھیں، کسی قسم کی مزاحمت کی۔اس کے ساتھ ہی یہ بھی سوچئے کہ اس سے جو ایک ہزار ناجائز بچے پیدا ہوئے، ان کی نسل آج تک چلتی آ رہی ہے، ان کے متعلق کیا کہا جائے گا۔آپ سوچئے کہ کیا ایسی تاریخ کو قابلِ اعتماد قرار دیا جائے گا۔جس میں اس قسم کی روایات ہوں؟۔اور تاریخ بھی وہ جو، بغیر کسی سابقہ ریکارڈ کے محض زبانی روایات کی بنیاد پر، صدرِ اول کے اڑھائی تین سو سال بعد، اس زمانے میں مرتب کی گئی ہو جب مسلمانوں میں گروہ بندانہ تعصب عام ہو چکا تھا!۔اس کے جواب میں مودودی صاحب نے جو کچھ کہا وہ قابلِ غور ہے۔

مودودی صاحب کا اصرار:۔ انہوں نے مختلف کتبِ تاریخ کے نام گنوانے کے بعد کہا کہ:۔اب غور فرمائیے۔یہ ہیں وہ مآخذ جن سے میں نے اپنی بحث میں سارا مواد لیا ہے۔اگر یہ اُس دور کی تاریخ میں قابلِ اعتماد نہیں ہیں تو پھر اعلان کر دیجئے کہ عہدِ رسالت مآب ﷺ سے لے کر آٹھویں صدی تک کی کوئی اسلامی تاریخ دنیا میں موجود نہیں کیونکہ عہدِ رسالت مآب ﷺ کے بعد سے کئی صدیوں تک کی پوری اسلامی تاریخ شیخین کی تاریخ سمیت، انہی ذرائع سے ہم تک پہنچی ہے۔اگر یہ قابلِ اعتماد نہیں تو ان کی بیان کی ہوئی خلافتِ راشدہ کی تاریخ اور ائمہء اسلام کی سیرتیں اور ان کے کارنامے، سب اکاذیب کے دفتر ہیں جنہیں ہم کسی کے سامنے وثوق کے ساتھ پیش نہیں کر سکتے۔دنیا کبھی اس اصول کو نہیں مان سکتی، اور دنیا کیا، خود مسلمانوں کی موجودہ نسلیں بھی اس بات کو ہرگز قبول نہ کریں گی کہ

ہمارے بزرگوں کی جوخوبیاں یہ تاریخیں بیان کرتی ہیں، وہ تو سب صحیح ہیں، مگر جو کمزوریاں یہی کتابیں پیش کرتی ہیں، وہ سب غلط ہیں (خلافت وملوکیت۔ص۔۳۱۶)۔''

طلوعِ اسلام جنوری ۱۹۸۴ء۔ص۔۳۔''تربیت گاہِ رسالتمآب ﷺ میں جس انداز کے انسان تعمیر ہوئے تھے، اُن کی توصیف و ستائش سے قرآن کریم کے اوراق مزین ومرصع ہیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی شانِ اقدس میں ذاتِ باری تعالیٰ نے اِن الفاظ میں تبریک وتحسین کے پھول نچھاور کیے تھے کہ:۔ **اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ** (33:56)۔ اللہ اوراس کے فرشتے نبی ﷺ پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ بعینہٖ یہی الفاظ تربیت یافتگانِ نبوی ﷺ کے لئے آئے ہیں۔ فرمایا:۔ **هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ** (33:43)۔اے جماعتِ مومنین! خدااوراس کے فرشتے تم پر درودوسلام بھیجتے ہیں۔اُن کی رفاقت کی عظمت کے سلسلے میں کہا کہ:۔ **يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ** (8:64) ۔ اے نبی! تیرے لئے خدااور یہ مومن جو تیرا اتباع کرتے ہیں کافی ہیں۔اللہ تعالیٰ نے ان سب کو مومن حقا کہہ کر پکارا ہے۔ یہ تھی وہ جماعتِ مومنین جن کی رفاقت سے حضور ﷺ نے اسلامی نظام قائم کیا۔''(اس سلسلہ میں ''نظریہء اسلامی مملکت'' میں ''مہاجرین وانصار۔دوسیاسی پارٹیاں'' کے تحت بھی ملاحظہ فرمائیں۔موءلف)۔

منافقین:۔قرآن کریم میں منافقین کی سخت مذمت کی گئی ہے۔کیونکہ منافقین کافروں سے بھی زیادہ خطرناک لوگ تھے جو مسلمانوں کے اندر،اُن کے ساتھ موجود تھے۔ بظاہر وہ مسلمانوں کے حامی مگر دل سے ان کے مخالف تھے۔لہٰذا، موقع ملتے ہی مسلمانوں کو عملی یا نفسیاتی طور پر نقصان پہنچاتے اور ہر وقت اسی تاک میں رہتے تھے۔آج بھی منافقین کے یہی کرتوت ہوتے ہیں۔قرآن کریم میں منافقین کی بہت سی نشانیاں بتائی گئی ہیں۔ پرویز صاحب تبویب القرآن میں ''منافق'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:۔''منافقین کو قرآن نے بدترین خلائق قرار دیا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیئے۔کھلے ہوئے دشمن سے آپ ہر وقت محتاط رہ سکتے ہیں۔لیکن جو مارِ آستیں بن کر چھپا رہے، اس کے متعلق آپ کو گمان بھی نہیں ہوسکتا کہ وہ دشمن ہے۔اس لئے قرآن کریم میں منافقین کا بڑی تفصیل سے ذکر آیا ہے۔اوران سے محتاط رہنے کی سخت تاکید کی گئی ہے۔یادر ہے کہ منافقین کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا۔جب بھی کسی کی زبان اس کے دل سے ہم آہنگ نہ ہو۔یا اس کا کردار اس کے دعوے کی تصدیق نہ کرے، وہ نفاق کا مرتکب ہوتا ہے۔قرآن نے اسے ''دل کی بیماری'' یعنی (نفسیاتی مرض) قرار دیا ہے۔۔۔۔جماعت میں وسوسہ انگیزیاں کرنے والے، ان میں بزدلی پھیلانے والے۔لوگوں کو دکھانے کی خاطر نیک کام کرنے والے۔امت میں تفرقہ پیدا کرنے کے لئے مسجدیں تعمیر کرنے والے۔ جنگ سے گریز کی راہیں تلاش کرنے والے، مشکل کے وقت بہانے تراشنے والے۔ ہر وقت تنقیدیں اور اعتراضات کرنے والے۔ کچھ دے کر احسان جتانے والے۔۔ یہ

اعتراض کرنے والے کہ ہماری بات کیوں نہیں مانی جاتی، ہماری مرضی کے مطابق پروگرام کیوں نہیں بنایا جاتا۔ جب اپنا فائدہ نظر آئے تو شریکِ پروگرام۔ جب ذاتی منفعت نہ ہو تو کنارہ کش۔ یہ ہیں مختصراً وہ خصوصیات جن کے حامل منافق کہلاتے ہیں۔ قرآن نے اس خصلت کو کفر سے بھی زیادہ شدید مستوجبِ عذاب قرار دیا ہے۔ جماعت پر تباہیاں آتی ہی منافقین کے ہاتھوں ہیں۔ ہماری ساری تاریخ اس کی شاہد ہے اور قرآن کریم کے اس معیار کی رو سے کہ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں لیکن ان کا عمل ان کے اس دعویٰ کا ثبوت بہم نہیں پہنچاتا، ہمیں خود اپنی حالت پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ ہمارا مقام کیا ہے۔''

بلاشبہ منافقین کا ذکر قرآن میں آیا مگر حیرت ہے کہ کچھ لوگ سوائے چند صحابہؓ کے، اکثریتِ صحابہؓ حتیٰ کہ حضور ﷺ کے قریب ترین لوگوں کو بھی آج تک منافقین کی صف میں شمار کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم کی شہادت ہے کہ:۔رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں منافقین مسلمانوں کے اندر ملے ہوئے تھے۔ لیکن آخرالامر یہ چھٹ کر الگ ہوگئے تھے اور مسلمانوں کی ایک خالص جماعت الگ رہ گئی تھی (۳/۱۷۸)۔ کیونکہ حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ:۔ان (منافقین) سے دوست داری کے تعلقات جائز نہیں (۱۹۔۳/۱۱۷۔۴/۸۹۔۱۵۔۱۴/۵۸)۔ ان (منافقین) سے بھی کفار کی طرح جنگ کرو (۴/۸۹۔۷۳۔۹/۷۳۔۶۶/۹)۔ اب یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ حضور ﷺ، اللہ تعالیٰ کے احکامات سے (نعوذ باللہ) روگردانی کرتے ہوئے منافقین کے ساتھ دوستی رکھیں یا اُن کے خلاف جنگ کر کے اُن کو ختم نہ کردیں اور ''خبیث کو طیب'' سے الگ نہ کردیں۔ لہٰذا، قرآن کریم سے یہ ثابت ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی زندگی ہی میں اپنی جماعت سے منافقین کا وجود ختم کردیا تھا۔ اور ان ﷺ کی وفات کے وقت مسلمانوں کی الگ خالص اور مخلص جماعت موجود تھی۔ ''یہ نہیں ہوا کہ جب منافقین کے متعلق علم ہوگیا تو پھر بھی انہیں معاشرہ کا جزو بنائے رکھا۔ اس طرح تو وہ معاشرہ اُسی زمانے میں تباہ ہو جاتا۔'' (طلوعِ اسلام فروری ۱۹۷۲ء۔ص۔۶۳)۔ پرویز صاحب نے مطالب الفرقان کی پہلی جلد کا تیسرا باب ''منافقین'' کے لئے مختص کیا ہے اور سورہ بقرۃ کی آیت نمبر ۸ سے اس کا سلسلہ شروع کیا ہے جس کے مطالعہ سے ''منافقین'' اور ''صحابہ کرامؓ'' کی پوزیشن سامنے آجاتی ہے (موءلف)۔

تطہیر:۔ طلوع اسلام مئی ۱۹۸۱ء۔ صفحہ نمبر ۹۔ ''اس پر کہا یہ جاتا ہے کہ کیا ہم تاریخ اور روایات کے اس سارے مواد کو دریا برد کردیں؟ کون کہتا ہے کہ انہیں دریا برد کردو!۔ دریا برد نہیں، ان کی تطہیر کرو۔ (مثلاً) قرآن کریم نے صحابہ کبارؓ (مہاجرین وانصار) کی جو صفات وخصوصیات بیان فرمائی ہیں، وہ یقینی ہیں اور ان کی صداقت پر ہمارا ایمان ہے۔ اب اگر تاریخ یا روایات میں کوئی ایسی بات ملتی ہے جو ان خصوصیات اور امتیازات کے خلاف ہے تو ہم کہہ دیں گے کہ تاریخ کا یہ بیان صحیح نہیں۔ اس سے کوئی قیامت نہیں

ٹوٹ پڑے گی لیکن اگر ہم تاریخ یا روایات کے اس قسم کے بیان کو سچا تسلیم کرلیں تو قرآن کریم کی شہادات (معاذ اللہ) جھوٹی قرار پا جائیں گی۔ انہیں جھوٹا سمجھنے سے تو ہمارا ایمان ہی باقی نہیں رہے گا! لیکن ہمارے ہاں سند اور حجت، تاریخ اور روایات کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی کوئی پروا نہیں کی جاتی کہ قرآن کی شہادت اس کی تائید کرتی ہے یا اس کے خلاف جاتی ہے! نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔ ہم یہ کہتے چلے آرہے ہیں کہ اُمت کو چاہیئے کہ قرآن کریم کو یقینی اور آخری سند قرار دے کر، تاریخ اور روایات کے لٹریچر کو اس کی روشنی میں پرکھ لیا جائے۔ ان میں جو کچھ قرآن کے مطابق ہو، اسے صحیح تسلیم کرلیا جائے۔ جو اس کے خلاف ہو، اسے مسترد کر دیا جائے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس باب میں آپ بھی ہم سے متفق ہوں گے۔ حتیٰ کہ اگر آپ اسے ہمارے قدامت پسند طبقہ کے سامنے پیش کریں گے تو (نظری طور پر) وہ بھی اس کی معقولیت کے قائل ہوں گے۔ لیکن (اس کے باوجود) عملاً اس کے لئے کوئی تیار نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ تاریخ و روایات کے مرتبین اور جامعین کا تقدس ان کا جزوِ ایمان بن چکا ہے اور وہ اس کی ہمت ہی نہیں کر سکتے کہ جو کچھ ان حضرات کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، اس پر خفیف سی تنقیدی نگاہ بھی ڈالی جائے۔ جب تک یہ ذہنیت باقی رہے گی نہ ہمارے اختلافات رفع ہوں گے اور نہ ہی اسلام اپنی حقیقی شکل میں ہمارے سامنے آسکے گا۔ اختلافات اس لئے ختم نہیں ہوسکیں گے کہ اس لٹریچر میں باہمدگر متضاد باتیں موجود ہیں۔ کوئی فرقہ کسی روایت کے ساتھ متمسک ہے، کوئی کسی اور کے ساتھ۔ اور ان میں سے کوئی بھی اپنے مسلک میں ذرا سی تبدیلی کے لئے تیار نہیں۔ اور حقیقی اسلام اس لئے سامنے نہیں آسکے گا کہ اس لٹریچر میں بہت کچھ ایسا ہے جو حقیقی اسلام کے خلاف ہے۔''

صحابہ ءکرامؓ نے کیا کیا؟ ۔ چونکہ ہماری تاریخ کی تحریر اور ترتیب و تدوین اسلام کے دورِ اوّل کے تقریباً تین سو سال بعد عمل میں آئی اور تاریخ کے سلسلے میں تو احادیث کی طرح اسماء الرجال یا زیادہ احتیاط کی ضرورت کو بھی مدِنظر نہ رکھا گیا۔ لہٰذا اسے لکھنے والوں نے جیسے جی میں آیا، سنی سنائی کے مطابق تحریر کر دیا۔ جس کا نتیجہ ہمارے سامنے اس صورت میں آتا ہے کہ حضور کریم ﷺ کے براہِ راست تربیت یافتہ ساتھیوںؓ کا سیاسی کردار آج کے سیاست دانوں کے کردار سے ہو بہو ملتا جلتا نظر آتا ہے۔ لگتا ہے وہ وحی اور نبی ﷺ جیسی ہستی کی بجائے صدیوں بعد آنے والے سیاسی مفکر اور مدبر میکیاولی کے نظریات اور ذہنیت سے (معاذ اللہ) متاثر تھے یا اُس کے پیش رو۔ (ملاحظہ ہو مولانا مودودیؒ کی کتاب ''خلافت و ملوکیت'')۔ بہر حال! ایک مسلمان کا یہ یقین اور ایمان ہونا چاہیئے کہ صحابہ کرامؓ نے اپنے دور میں جو کچھ کیا ہوگا، قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں اور قوانین کے دائرے کے اندر، اپنے زمانے کے حالات کے مطابق ہی کیا ہوگا اور تب وہی کچھ ہوسکتا ہوگا، خواہ وہ اُن کا ذاتی معاملہ ہوتا ہوگا یا اُمورِ سلطنت۔ کیونکہ وہ تابعینِ وحی اور تربیت یافتہ ءرسول

اللہ علیہ وسلم تھے۔ اُن کے عمل کا گواہ خود قرآن کریم ہے جبکہ تاریخ کی من گھڑت کہانیاں اُنؓ کے بارے میں درست گواہی نہیں دے سکتیں۔

اختلافِ رائے اور اختلافِ عمل:۔ نظامِ حکومت کے چلانے کے لئے قرآن کریم نے امت کو ''باہمی مشاورت'' کا حکم دیا ہے۔ مشاورت کے عمل کے دوران میں اکثر اوقات اختلافِ رائے پیدا ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اختلافِ رائے کی تو گنجائش اور اجازت ہے مگر اختلافِ عمل کی نہیں۔ صحابہ کرامؓ بھی مختلف ذہنی صلاحیتوں کی بناء پر یقیناً اپنی اپنی الگ رائے کے حامل تھے مگر اختلافِ عمل کو قرآن کریم کے احکامات کے خلاف سمجھتے تھے۔ مثلاً حضور کریم علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد لشکرِ اسامہؓ، مانعینِ زکواۃ اور جھوٹے مدعیانِ نبوت وغیرہ جیسے مسائل سامنے آئے تو ان مسائل کے حل کے لئے دورانِ مشاورت صحابہ کرامؓ کا اختلافِ رائے سامنے آیا مگر جب مرکزِ خلافت کی طرف سے ایک فیصلہ کر دیا گیا تو اختلافِ رائے رکھنے والے انہی صحابہ کرامؓ نے احکاماتِ خلافت کے مطابق عمل کیا اور اپنی الگ (ذاتی) رائے ترک کر دی (موءلف)۔

مسئلہءِ خلافت:۔ اسی ضمن میں، ہماری تاریخ کے دورِ اوّل کی افسانوی باہمی جنگوں پر فضول بحثوں اور فرقہ وارانہ تصادمات کے علاوہ، ''مسئلہء خلافتِ رسول اللہ علیہ وسلم'' بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یعنی ایک اسلامی حکومت میں خلیفہ کا طریقِ انتخاب کیا ہونا چاہیئے؟ خلافت کیسی ہو؟ اور جو الگ الگ طریقہ ہائے کار برائے انتخابِ خلیفہ، خلفائے راشدینؓ نے اختیار کئے تھے، کیا وہ صحیح تھے؟ اور اگر اب کوئی اسلامی حکومت آئے تو خلیفہ کے انتخاب کے لئے، خلفائے راشدینؓ کے اختیار کردہ مختلف طریقوں میں سے کس طریقہ کو اپنائے؟۔ اس مقصد کے لئے اسلام کے دورِ اوّل کے حالات پر بحث کی جاتی ہے (مئولف)۔۔ مئولف نے پرویز صاحب سے اس بارے میں استفسار کیا تو اُنہوں نے اکتوبر ۱۹۷۹ء کے ''طلوعِ اسلام'' (ص۔۹ تا ۲۱) میں مئولف کے ان سوالات کا جواب شائع فرمایا۔ ملاحظہ ہو:۔ ''معلوم نہیں ''خلافت'' سے آپ کی مراد کیا ہے۔ اگر اس سے مراد اسلامی حکومت ہے تو جو حکومت اپنے جملہ معاملات میں قرآنی اقدار کی پابند ہو اسے اسلامی حکومت یا خلافت علیٰ منہاج نبوت کہا جائے گا جہاں تک انتخاب یا حکومت کے کسی اور طریق کار کا تعلق ہے، اس باب میں ایک اصول کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

اصول اور تفصیلات:۔ قرآن مجید نے جن امور کی تفصیلات خود متعین نہیں کیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انہیں ہمیشہ کے لئے غیر متبدل اور ابدی قرار دینا منشائے خداوندی نہیں تھا۔ اُس نے اصول اور حدود متعین کر دیئے اور اسے اُمت کی صوابدید پر چھوڑ دیا کہ وہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے ان کی تفاصیل اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود متعین کرے۔ یہ حدود و اقدار تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گی لیکن ان کی جزئیات اور انہیں روبہ عمل لانے کا طریقِ کار ضروریاتِ زمانہ کے مطابق بدلتا رہے گا۔ بنا بریں، کسی

ایک زمانے میں اختیار کردہ طریق، آنے والے زمانوں کے لئے لازمی نہیں قرار پاتا۔لہٰذا، ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ صحابہؓ نے کیا طریقِ عمل اختیار کیا تھا۔اوّل تو، جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا، ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں جس کی رو سے ہم حتمی اور یقینی طور پر کہہ سکیں کہ انہوں نے کیا طریق کار اختیار فرمایا تھا۔چونکہ قرآن کریم نے انہیں مومن حقّہ قرار دیا ہے اس لئے یہ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اُنہوں نے جو طریق بھی اختیار فرمایا ہوگا، وہ قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے اختیار کیا ہوگا۔(اس کی تفصیل آپ کو میری کتاب ''شاہکارِ رسالت'' میں ملے گی)۔دوسرے یہ کہ ہم پر اس کی من وعن پابندی لازمی نہیں۔

اُصول اور شرط:۔ اُنہوں نے وہ طریق اپنے حالات کے مطابق اختیار کیا ہوگا۔قرآن نے اصول یہ بیان فرمایا ہے کہ امورِ مملکت باہمی مشاورت سے طے کرو۔اس مشاورت کا طریقہ کیا ہوگا، اسے اُس نے ہم پر چھوڑا ہے کہ ہم اپنے حالات کے مطابق جو طریقِ کار مناسب سمجھیں اختیار کرلیں۔۔شرط وہی ہوگی کہ یہ طریقِ کار قرآن مجید کے اصول، اقدار اور حدود سے متصادم نہ ہو۔'' مئولف کے سوال کے باقی حصّے کا جواب دیتے ہوئے، آگے چل کر لکھتے ہیں۔''باقی رہا آپ کا یہ سوال کہ ''کیا صحابہ ءثلاثہؓ کا طریق درست تھا؟۔'' سواوّل تو (جیسا کہ لکھا جاچکا ہے) ہم یقینی طور پر کہہ ہی نہیں سکتے کہ اُن کا طریق کیا تھا۔دوسرے یہ کہ ہمیں ان کے اعمال و کردار کو موضوعِ بحث بنانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔اللہ تعالیٰ ہم سے یہ نہیں پوچھے گا کہ حضرت عمرؓ یا حضرت صدیقِ اکبرؓ کا طریق درست تھا یا نہیں۔وہ ہم سے ہمارے طریق ہی کے متعلق پوچھے گا۔اُس نے یہ بنیادی اصول بیان کر دیا ہے کہ:۔(مفہوم)۔''یہ لوگ اپنے اپنے وقتوں میں دنیا سے چلے گئے۔جو کچھ انہوں نے کیا وہ اُن کے لئے تھا۔جو کچھ تم کروگے، وہ تمہارے لئے ہوگا۔تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ اُنہوں نے کیا کیا تھا۔'' (۲/۱۴۱)۔چونکہ قرآن مجید نے جملہ صحابہؓ کے متعلق کہا ہے کہ وہ سچے اور پکے مومن تھے (۸/۷۴)، اُن کے لئے جنت کی بشارت ہے (۹/۱۰۰)۔تفصیل ''شاہکارِ رسالت'' میں ملے گی، لہٰذا، قرآن مجید کی اس شہادت کی بناء پر، ہمارا یہ ایمان ہونا چاہیئے کہ صحابہ کبارؓ کی سیرت قرآن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔عہدِ رسالتمآب ﷺ اور زمانہ ءصحابہؓ کی تاریخ اور احادیث کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ ان میں جو باتیں قرآن کریم کے مطابق ہیں اُنہیں میں صحیح سمجھتا ہوں۔جو قرآن کے خلاف ہیں انہیں غلط قرار دیتا ہوں۔اسی قسم کی احادیث کے صحیح ہونے کا انکار ہے جس کی بناء پر مجھے منکرِ حدیث، فلہٰذا، کافر قرار دیا جاتا ہے۔''

(نوٹ):۔ تاریخِ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کے بارے میں مزید مطالعہ کے لئے پرویز صاحب کی کتب ''شاہکارِ رسالت'' ''معراجِ انسانیت'' اور ''سلیم کے نام'' (تاریخ کے سلسلہ میں خطوط) کی سفارش کی جاتی ہے۔ان کتب میں انہوں نے وہ احادیث اور واقعات پیش کئے ہیں، جو انہیں اپنی بصیرت کے مطابق قرآن کریم کے خلاف نظر نہیں آئے۔

راجہ عبدالعزیز خان (دھیر کوٹ آزاد کشمیر)

بگ بینگ سنگولیرٹی اور قرآن

حکمائے مغرب کی اکثریت نے انسان کو بھی گذشتہ سلسلہ ارتقا کی آخری کڑی قرار دیا ہے اور جسمانی یا مادی نقطہ نظر سے انسان کے بارے میں یہ بات درست بھی ہے لیکن قرآن عظیم کے مطابق انسان (دیگر حیوانات کی طرح) صرف طبعی جسم سے ہی عبارت نہیں بلکہ جسم کے علاوہ اسے ذات، نفس، خودی، یا روح (Devine Energy) جیسی نعمت سے بھی نوازا گیا ہے اس الوہی توانائی کے حصول کے بعد انسان نہ صرف حیوانات سے منفرد اور نمایاں حیثیت اختیار کر گیا ہے بلکہ گذشتہ میکانکی ارتقا سے بالکل ایک الگ نئی مخلوق (خلقاً اخرٰ 23/14) کی شکل میں سامنے آیا ہے اب انسان اور حیوان میں بنیادی فرق ہے بقول برگساں کے جس بنیادی غلطی نے ارسطو سے لے کر آج تک فلسفہ فطرت کو مکدر کر رکھا ہے وہ یہ ہے کہ اس فلسفے کی روح سے نباتاتی احساس حیوانی جبلت اور انسانی شعور کو ایک ہی میدان (Tendency) کے تین درجے تسلیم کیا جاتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک عمل کی تین مختلف شاخیں ہیں جو ایک دوسرے سے یکسر الگ الگ ہیں ان میں باہمی فرق نہ تو درجات (Degree) کا ہے اور نہ ہی شدت (Intensity) کا ہے ان میں نوعی فرق (Difference of Kind) ہے (نظریہ خیر از ڈاکٹر انعام الحق) اسی ذات کے طفیل انسان کو اختیار و ارادہ اور خود شعوری عطا ہوئی جسکی وجہ سے انسانی ذات کا عملی اظہار ہوتا ہے۔ انسان کو جسم کی طرح نفس بھی غیر نشو نما صورت میں ملتا ہے۔ جسم کی پرورش طبعی قوانین کے تحت ہوتی ہے لیکن ذات کی نشو نما وحی خداوندی پر ایمان اور اسکے مطابق کئے گئے اعمال صالحہ سے ہوتی ہے۔ علم وحی اللہ تعالی کی طرف سے حضرات انبیائے کرام کو براہ راست ملتا تھا جسے وہ دوسرے لوگوں تک پہنچاتے تھے ختم نبوت کے بعد (نبی کریم ﷺ پر آسمانی رشد و ہدایات کا سلسلہ مکمل ہونے پر ختم کر دیا گیا تھا) اللہ تعالی کے آخری نبی ﷺ نے وحی الہی کو قرآن مجید میں محفوظ کر کے امت کے حوالے کر دیا تھا۔ آپ ﷺ کے بعد یہ امت مسلمہ کا فریضہ ہے کہ وہ اللہ کے آخری پیغام کو پوری انسانیت تک پہنچائے اب جسکا جی چاہے برضا و رغبت وحی الہی کی اطاعت کر کے دنیا اور آخرت کی زندگی میں ایسے جنتی معاشرے میں داخل ہو جائے جس کی شادابیوں، خوش حالیوں، رعنائیوں، کشادگیوں، فراوانیوں، فراغیوں اور بلندیوں جیسی نعمتوں میں کبھی کمی نہیں آئے گی۔

اس کے برعکس جو چاہے ان قوانین سے سرکشی اختیار کرکے تباہی اور بربادی کے جہنم میں گر جائے۔

حضور نبی کریم ﷺ سلسلہ نبوت کی آخری کڑی ہیں آپ ﷺ بھی دیگر انبیا کی طرح لوگوں تک پیغام الٰہی پہنچاتے تھے۔ ارشاد خداوندی ہے ہمارا یہ رسول ﷺ ہمارے ضابطے کے مطابق نوع انسانی کو نظام خداوندی کی طرف دعوت دیتا ہے اور انسانی زندگی کی تاریک راتوں میں سورج کی طرح جگمگاتا ہے 33/46 آپ ﷺ قوانین خداوندی کی غرض وغایت بھی بیان کرتے تھے اور انسانوں کی صلاحیت کو اجاگر کرنے کے لیے انکے سامنے عملی پروگرام بھی پیش کرتے تھے۔ احکامات الٰہی کی اطاعت سے یقیناً انسان کی انفرادی زندگی میں حسن ونکھار آجاتا ہے لیکن ان حکامات پر معاشرے میں اجتماعی طور پر عمل کرکے ہی ان کے بھرپور نتائج حاصل کئے جاسکتے ہیں یہی وجہ ہے کے حضور اکرم ﷺ نے موقع ملنے پر مدینہ شریف میں پہلی اسلامی ریاست اور حکومت کی بنیاد رکھ کر اپنے عظیم پروگرام کو آگے بڑھایا۔ آپ ﷺ کی ذات مبارکہ اسوہ حسنہ ہے لہذا آج بھی مسلمانوں کے لیے موجودہ تشتت وانتشار اور زوال پزیری کی لعنتی کیفیت سے نکلنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اتباع رسول ﷺ کے تحت پروگرام مرتب کرکے اس پر عمل کریں۔

کیوں کہ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لئے ایک ہی صراط مستقیم ہے جس پر اس ذات اقدس واعظم ﷺ کے نقوش قدم جگمگ جگمگ کررہے ہیں جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقام خویش گر خواہی دریں دنیا۔۔۔ بحق دل بندو راہ مصطفےٰ ﷺ رو۔۔

یہ تھا حاصل بہار چمن کائنات کہ جسکا ظہور صبح بہار کائنات تھا (معراج انسانیت از علامہ پرویزؒ)

قرآن پاک بنیادی طور پر نوع انسانی کے لئے ہدایت اور راہنمائی کا سرچشمہ ہے اسکے احکامات اور عقائد اس انداز سے الگ الگ اور نکھار کر بیان کئے گئے ہیں کہ ان میں سے کسی پہلو سے بھی تشنگی اُبہام ریب اور التباس نہیں رہتا (41/3) ان اور ایسے دیگر امور کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ہر لفظ اپنا متعین مفہوم ومعنی سامنے لے آتا ہے لیکن آیات متشابہات کے تحت ایسے بسیط حقائق بھی بیان کئے گئے ہیں جن میں کچھ تو مادی کائنات سے ماوراہیں (مثلاً خدا کی ذات یا حیات اخروی کے حالات وواقعات وغیرہ) اور کچھ انسانی زندگی سے متعلقہ دیگر امور کے علاوہ کائنات کے بارے میں جو نزول قرآن کے زمانے میں ہی نہیں بلکہ بہت بعد کے زمانے تک انسانی عقل اور بصیرت سے پوشیدہ تھے۔ اس وقت کے پوشیدہ حقائق پر پڑے ہوئے پردے اب بے نقاب ہورہے ہیں کیوں کہ قرآن پاک کی پیشنگوئی کے مطابق رموز کائنات میں جو راز بھی منکشف ہوگا وہ قرآن کے کسی نہ کسی دعوے کی صداقت کا ثبوت ہوگا (41/23) مگر قرآن مجید کی تعلیمات کو سنجیدگی سے نہ لینے والے حضرات کی طرف سے مسلمانوں پر اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ

قرآن میں اگر واقعی ایسے حقائق کا ذکر ہے تو یہ کسی تصور یا دریافت ہونے سے قبل اس کا ذکر کیوں نہیں کر دیتے؟۔

ہماری موجودہ حالت زار کے پیش نظر بظاہر یہ اعتراض کچھ نامناسب بھی نہیں قارئین یقین کریں اگر ہم ذہنی اور علمی پسماندگی، سہل انگاری، کاہلی، حصول طبیعات وتسخیر کائنات سے معذوری، سیاسی اور اقتصادی محتاجی، اخلاقی زوال پزیری، ہرقسم کی بدحالی اور کمزوری اور سب سے بڑھ کر احکامات خداوندی کی عملی نافرمانی بلکہ سرکشی جیسی قباحتوں کا شکار نہ ہوتے تو نہ قرآن پر ایسے شبہات اور اعتراضات ہوتے اور نہ اللہ کے آخری نبی ﷺ پر وقتاً فوقتاً اہانت اور توہین آمیز رکیک حملے کئے جاتے۔ ان گستاخانہ اور ناپاک سازشوں کی مختلف لوگ مختلف وجوہات بیان کر کے ان کے ازالہ کیلئے مختلف حل پیش کرتے ہیں۔ میرے خیال میں اس کی بنیادی وجہ صرف ایک ہے کہ ہم انکے مقابلے میں ہر پہلو سے نہ صرف کمزور ہیں بلکہ انکے محتاج بھی ہیں نیز ان سازشوں کے ازالہ کی بھی صرف ایک ہی صورت ہے کہ ہم سیاسی اور اقتصادی علم اور ٹیکنالوجی اور دفاعی لحاظ سے اتنے طاقت ور بن جائیں تاکہ ایسی گستاخی کرنے والے ممالک کو کم ازکم ہم سے خطرے کا تو احساس ہو۔ قرآن مجید نے تو مسلمانوں کو حکم دے رکھا ہے کہ دفاعی لحاظ سے تم کو اتنا طاقت ور ہونا چاہیئے کہ دشمن پر تمہارا رعب طاری رہے (8/60) اب بھی اگر ہم نے قرآنی حکم پر عمل نہ کیا تو ہمیں ان سازشوں کیلئے مزید تیار رہنا چاہیئے۔ ہم ان سے جتنا بھی انصاف کا تقاضا کریں وہ ہم پر ترس نہیں کھائیں گے البتہ زبانی کلامی مزمت اور احتجاج کرنا ہمارا حق ہے اور ہم یہ کر بھی رہے ہیں اور کرنا بھی چاہیئے لیکن جس طرح ہم احتجاج کر رہے ہیں ان کے نتائج ہمارے لئے بھیانک اور انکے لئے مزید خوشی کا باعث بن رہے ہیں۔

جہاں تک مسلمانوں پر اعتراض کا تعلق ہے تو اسکی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان حضرات کی قرآن تک براہ راست رسائی کم ہی ہوتی ہے۔ انکی اطلاعات زیادہ تر فرضی داستانوں اور سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہوتی ہے اور ایک خطرناک حقیقت یہ ہے کہ ایسی بے بنیاد کہانیوں کو اسلام یا قرآن سے منسلک کر کے ہم خود ان لوگوں کو خام مواد مہیا کر رہے ہیں۔ مثلاً چاند پر پہلا انسانی قدم رکھنے والے خلا نورد نیل آرمسٹرانگ کا پچھلے دنوں انتقال ہو گیا تھا وہ ایک نفیس انسان تھے۔ چاند پر اپنے پہلے قدم کے نشان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے مشہور فقرہ کہا تھا ''چاند پر انسان کا یہ چھوٹا سا قدم انسانیت کے لئے بہت بڑی جست ثابت ہوگا'' انکے بارے میں فرضی داستان بنالی گئی تھی کہ مصر میں انہوں نے اذان کی آواز سن کر اسلام قبول کر لیا تھا کیوں کہ اذان کی یہ آواز وہ چاند پر بھی سن چکے تھے یہ افواہ اتنی مشہور ہوئی کہ انہیں خود اسکی تردید کرنا پڑی انہوں نے کہا کہ میں اسلام کا احترام کرتا ہوں مگر میں نے اسلام قبول نہیں کیا (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور 10 April, 1983) قرآن غیر محرف اور اسلام سچا دین ہے اسے ایسی مصنوعی بے ساکھیوں کی

ضرورت نہیں یوں بھی یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام کے دور اول میں مسلمانوں نے قرآنی تعلیمات کی رہنمائی میں انسانی معاملات یعنی سوشل سائنسز کے ساتھ ساتھ کائنات پر بھی تحقیق و تفتیش، مشاہدات اور تجربات پر غور و تدبر شروع کر دیا تھا۔

حضرت علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں ماضی کے مسلمانوں کی علمی اور سائنسی خدمات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے انہوں نے مغربی مورخین کی تصانیف نیز مسلمان مفکرین کی اپنی کتابوں کو بنیاد بنا کر ثابت کیا ہے کہ اس دور کے مسلمانوں نے کائنات میں ارتقاء، وسعت کائنات وقت اور کائنات کا باھمی رشتہ، جامد کائنات کی تردید، حرکی کائنات کا اثبات، کائنات میں نئی نئی تخلیقات کا تصور، سلسلہ ارتقاء، میں زندگی کے مختلف مراحل اور تاریخ کی اہمیت جیسے موضوعات پر تحقیق اور تجربات کے بعد انکے لئے ابتدائی نظریات قائم کئے ہیں۔ علامہؒ نے دوسرے خطبے میں مسلمانوں کی سائنسی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے غیر مسلم مورخین اور مفکرین کا حوالہ دیا ہے جنہوں نے مسلمانوں کی ان خدمات مثلاً علم فلکیات، طبیعات، کیمیا، طب، ریاضیات، حیوانات، نباتات، سائنسی رصد گائیں، روشنی، علم نجوم، نئی نئی ایجادات، جواہر و عروض کے علاوہ تاریخ جغرافیہ فلسفہ، بصریات، ادبیات، لغات، شاعری، تصوف اور موسیقی وغیرہ کا بھرپور اعتراف کیا ہے۔ علامہؒ کے نزدیک قرآن کی روح فلسفۂ یونان کے منافی ہے قرآن کائنات کا حرکی تصور دیتا ہے جبکہ یونانی فلسفے کا جامد کائنات پر ایمان تھا لہذا ایسے اعتراضات کرنے والوں کو حقیقی صورت حال جاننے کے لئے قرآن اور تاریخ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ کسی بھی مذہب کے پیروکاروں کی بدحالی کو دیکھ کر انکے مذہب کا اندازہ لگانا درست نتائج تک نہیں پہنچا سکتا علامہ نیاز فتح پوری مرحوم نے ایک بڑی خوبصورت بات کہی ہے۔ ہم کو اصول مذہب کی جستجو تاریخ سے ہٹ کر صرف اسکی تعلیم میں کرنی چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ مذہب اپنے عمل یا تعلیمات زندگی کے لحاظ سے ایک جگہ ٹھہر جانے والی چیز ہے یا ترقی و تمدن کے ساتھ ابھرنے اور بلند ہونے والی (من و یزداں)

خدا اور کائنات کے باہمی تعلق کے بارے میں عہد قدیم سے متعدد تصورات چلے آرہے ہیں ان میں ایک نظریہ Deism کا ہے یعنی کہ الوہی ہستی نے یہ کائنات بنائی لیکن اسکے بعد یہ لاتعلق ہو کر صرف اسکا نظارہ کر رہا ہے کچھ لوگوں نے ایسے خدا کو بیان کرنے کے لئے گھڑی ساز کا استعارہ بھی استعمال کیا ہے اسکے برعکس ایک Theism کا نظریہ ہے۔ یعنی ہمہ از اوست۔ اسکے تحت خدا کائنات کا خالق ہے اور دنیا کے معاملات میں عملاً ملوث ہے یہ خدا انسان کے ساتھ مسلسل ذاتی تعلق میں رہتا ہے اور بطور ہادی اس کی رہنمائی کرتا ہے لیکن تصوف کے نظام Pantheism یا ھمہ اوست میں خالق و مخلوق کے درمیان کسی فرق کو روا نہیں رکھا جاتا اس نظام میں ہر چیز خدا کا حصہ ہے اور خدا ہر چیز میں موجود ہے۔ ابن عربی مرحوم کہتے ہیں کہ اللہ کے اسماء حسنہ میں سے ایک نام علی بھی ہے اور وہ کس پر علی

ہوگا کیوں کہ عالم میں سوائے اسکے دوسرا کوئی نہیں وہ بذات علی ہے وہ کس سے عالی ہے کیوں کہ سوائے اسکے اور کیا ہے؟ پس اس کو بنفسہ علو ہے اور با اعتبار موجود کے وہ موجودات کا عین ہے جن کا نام محدثات ہے وہ بذاتہ عالی اور بلند ہے کیوں کے موجودات سوائے حق کے اور کوئی شے نہیں ہے (فصوص الحکم)۔ بقول سید علی عباس ویدانت، اشراقیت اور ابن عربی کے وحدت الوجود میں بنیادی اصول اور قدریں ایک ہیں۔ وحدت الوجود اور ویدانت میں اس قدر گہری مماثلت پائی جاتی ہے کہ بعض صوفیا اپنشدوں کو الھامی کتاب سمجھتے ہیں۔ فلاطینوس کے نظریے میں وجود ذات حق کے سوا کسی کا نہیں (اقبال کا علم کلام) پروفیسر سلیم یوسف چشتی مرحوم (جو خود بھی وجودی تصوف کے قائل تھے) بھی ایسا ہی سمجھتے تھے انہوں نے فلاطینوس اور شری شنکر اچاریہ کے اقوال کا بڑی عقیدت سے ذکر کیا ہے مثلاً شنکر اچاریہ کا یہ قول ہے کہ برھمن اگر چہ ایک ہے لیکن اس نے اپنی آزاد مرضی سے اپنے آپکو کائنات کی کثرت میں ظاہر کیا ہے یہ کائنات موہوم ہے اور برھمن موجود۔۔۔ برھمن حق ہے اور کائنات ایک نمود بے نمود (تاریخ تصوف۔ مختصر یوں سمجھئے کہ ہیریقلتیس، رواقیئن کا لوگس، افلاطون کا عین العیون، ارسطو کا محرک غیر متحرک، ویدانت کے شری شنکر اچاریہ کا برھمن یا برہم آتما اور ابن عربی کا وجود مطلق یہ سب ایک ہی فرضی وجود کے مختلف پہلو ہیں اللہ تعالی کی ذات ان باطل انسانی قیاسات سے مبرا اور بلند ہے اسکے سوا کائنات میں کسی کا اقتدار اور اختیار نہیں اس کی قدرت اور علم کی وسعتیں لامحدود ہیں وہ ہر چیز کا خالق ہے۔

ان ہی نظریات میں ایک سریانی یا آریائی نظریہ ہے اسکے مطابق خدا کا کائنات سے باہر کوئی وجود نہیں بلکہ کائنات کے ارتقاً کے ساتھ خدا بھی بتدریج وجود پزیر ہو رہا ہے (نعوذ باللہ) وہ کائنات میں جاری اور ساری ہے فجائی Emergent ارتقاً کے ایک بانی فلسفی الیگزینڈر کے مطابق خدا ازل سے کامل صورت میں موجود نہیں تھا اور خدا نے کائنات کو پیدا نہیں کیا بلکہ کائنات خدا کی تخلیق کر رہی ہے (نعوذ باللہ) ڈاکٹر انعام الحق نے ایسے نظریات کے بارے میں یوں تبصرہ کیا ہے۔ ان ارتقائی منازل کی امداد سے حکمائے مغرب نہ تو ابھی تک خدا کے تصور کا حتمی اندازہ لگا سکے اور نہ ہی ان کو اس کی کوئی امید نظر آرہی ہے لہذا خدا کے تصور کے بارے میں حکمائے مغرب کے نظریات کی اہمیت ایک تاریخی سرگزشت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی: (نظریہ خیر)۔ قرآن کریم کا یہ بھی ایک اعجاز ہے کہ وہ چند الفاظ میں بڑے بڑے الجھے ہوئے مسائل کو سلجھا دیتا ہے۔ سورۂ حدید میں اللہ نے اپنی صرف چار صفات (اول، آخر، ظاہر اور باطن) کو بیان کر کے اس صدیوں پرانے تنازعے کو حل کر دیا۔ علامہ پرویزؒ نے اس آیت مبارکہ کا مفہوم اس طرح بیان کیا ہے، اس کی ذات زماں ومکاں کی نسبتوں سے ماورا ہے سب سے اول بھی وہی ہے اور سب سے آخر بھی وہی اسکے لئے نہ ابتداء ہے اور نہ انتہا وہ ہر شے پر غالب ہے لیکن اس کا غلبہ غیر مرئی اور غیر محسوس طور پر کام کرتا ہے (قانون ہوتا ہی غیر مرئی اور غیر محسوس ہے لیکن اسکے نتائج

محسوس اور مرئی ہوتے ہیں)۔ یا یوں سمجھو کہ جملہ کائنات اسکی صفت خالقیت اور ربوبیت کی مظہر اور اسکی ہستی کی زندہ شہادت ہے لیکن اسکی ذات نگاہوں سے پنہاں اور مستور ہے اس اعتبار سے وہ باھمہ Immanent بھی ہے اور بے ھمہ Transcedent بھی۔ اسکا علم ہر شئے کو محیط ہے (مفہوم القرآن) یعنی اللہ تعالی نے اپنی ذات کا ایسا کامل واکمل غیر متبدل منزہ و پاکیزہ تصور دیا ہے کہ انسانی عقل کے لئے حیرت اور یکسر حیرت کے سوا کچھ نہیں رہتا اس کی ذات ان تصورات سے بہت بلند ہے جو انسانوں نے اپنے ذہن میں قائم کررکھے ہیں۔

انسانی زندگی کے ابتدائی دور میں کائنات کے بارے میں انسانی تصورات پر سحر و طلسم، اوہام پرستی، ظن وقیاس عجوبہ پسندی اور عقل وشعور سے عاری اساطیری (Myths) کہانیوں کے دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ تاہم وحی الٰہی کی روشنی اور خود انسانی علم وشعور میں بتدریج ترقی کے سبب انسان کے کائناتی نظریات میں بہتری آتی گئی ایک شہری ریاست آئیونیا کے ایک سائنسدان طالیس نے پہلی دفعہ کائنات کی مادی توجیہہ کی۔ اس کے صدیوں بعد ارسطو نے زمین مرکز کائنات کا ایک خاکہ تیار کیا۔ ارسطو کا خیال تھا کہ زمین کائنات کے مرکز میں ہے بہر حال ارسطو کے اس خاکے پر بعد میں سکندریہ کے ایک سائنسدان ٹالمی (PTOLMY) نے مزید تحقیق کے بعد کائنات کا ایک ماڈل تیار کیا جسے ارسطو ٹالمی ماڈل کہا جاتا ہے اس ماڈل میں ساکن زمین مرکز میں تھی اور سورج، چاند اور اس وقت میں معلوم پانچ سیارے مرکری وینس اور مریخ جیوپیٹر اسکے گرد گھومتے تھے۔ ارسطو ٹالمی ماڈل کو پہلا جھٹکا اس وقت لگا جب 1514ء میں پولینڈ کے ایک پادری سائنسدان کوپرنیکس نے سورج مرکز ماڈل ایک گمنام شخص کی حیثیت سے پیش کیا اور دوسرا صدمہ اس وقت برداشت کرنا پڑا جب 1609ء میں گلیلیو نے دریافت کیا کہ جیوپیٹر کے ساتھ مختلف چاند ہیں جو اپنے مداروں میں اس کے گرد گھومتے ہیں یعنی ہر چیز سورج کے گرد براہ راست نہیں گھومتی جیسا کہ اس وقت سمجھا جاتا تھا۔

یوں تو کوپرنیکس جونز کیپلر گلیلیو اور نیوٹن نے 17 ویں صدی ہجری میں کائنات کے بارے میں جدید نظریات کی بنیاد رکھ دی تھی لیکن 1915ء میں آئن سٹائن کی نئی تھیوری (General Theory of Relativity) نے کائنات سے متعلق گذشتہ اڑھائی ہزار سال کے تصورات کو یکسر بدل کررکھ دیا۔ مادے، توانائی، وقت اور خلا کے تصورات نے نئی شکل اختیار کرلی۔ مادے اور خلا کے باھمی تعلق کو مارکس شاؤن نے یوں Summarise کیا ہے Matter Tells space how to warp and warped space tell matter how to move (after glow of certain) بعد میں پلانک کے قوانٹم اصول اور ہیزن برگ کی Theory of Uncertainity جیسے نظریات نے آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کو کم از کم Atomic

Level پر ایک تھیوری کی حیثیت دے دی ہے سٹیفن کہتے ہیں

if we want to discribe the origin of the universe general relativity has to be replaced by a more complete theory because general relativity does not take into account the small scale structure of matter which is governed by quantum theory. So though we dont yet have a complete qunatumn theory of gravity we do know that the origin of the universe was a quantum event

نظریہ اضافیت کے مطابق ایک Particle مقام A سے مقام B کے درمیان حرکت کرتے ہوئے ایک ہی Path اختیار کرے گا لیکن قوانٹم اصول کے تحت ایسا نہیں ہوگا

According to Feynman a particle does not have a unique history that is it does not take unique path moves from its starting point 'A' to some and point 'B' but rathe simultaneously take every possible path connecting the two point.

اسی طرح پہلے سائنسدانوں کی تحقیق کے مطابق روشنی (‘Waves’) پر مشتمل ہوتی ہے لیکن اب اسکے متعلق بھی مختلف نظریات سامنے آئے ہیں۔ایک نظریہ یہ ہے کے Electromagnatic Waves یعنی روشنی صرف Discrete Quanta کی صورت میں ہی جزب یا خارج ہوسکتی ہے اس بارے میں ایک اور نظریہ ہے کہ روشنی Photon کبھی Waves پر مشتمل ہوتی ہے اور کبھی ذرات پر۔ مارک ساوٴن کہتے ہیں wave/partiole nature is one of the why light has this great mystries of science. In reality light is neither a particle nor a wave but some thing for which we have no word. مختصر یہ کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کائنات سمیت انسانی زندگی کے دیگر شعبوں کے بارے میں نئے نئے تصورات جنم لے رہے ہیں اور لیتے رہیں گے موجودہ دور میں سائنسدانوں کا خیال ہے کہ M.Theory ایسا نظریہ بن سکتا ہے جو کیلے پوری کائنات کی تشریح کرسکتا ہو یعنی Grand Unified Theory کی شکل اختیار کرسکتی ہو سٹیفن کا اس کے متعلق نظریہ ہے کہ

But we now have a candidate for the ultimate theory of every thing M.theory

is the only model that has all the properties we think the final theory ought to have and it is the theory upon which much of our latter discussion is based(Dbid page 8)

یہ سب بجا مگر دیکھئے کیا گزرتی ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

کائنات کے متعلق قرآن مجید نے ایک تو یہ بتایا ہے کہ یہ اللہ کی تخلیق ہے یعنی اسکی ایک ابتدا ہے 16/03 32/04 11/07 14/19 15/12 اور دیگر۔۔۔اللہ خالق بھی ہے 06/01 16/101 اور فاطر بھی 16/14 06/79 اور دوسرا یہ کہ کائنات اللہ کے قوانین کے مطابق پھیل رہی ہے 51/47 سید عبدالودود مرحوم نے اسے ان الفاظ میں بیان کیا ہے ترجمہ ہم نے آسمانوں کو اپنے ہاتھوں (قوت اور ہنرمندی) سے بنایا ہے اور ہم ہی اسے وسعت دے رہے ہیں کتنا عظیم اعلان اس زمانے میں کیا ہے جب انسان کی ذہنی سطح ابھی بے حد پست تھی (مظاہر فطرت اور قرآن) قرآن پاک کے یہ دونوں انکشافات اس وقت کے مروجہ نظریات کے بالکل برعکس تھے سائنسی دنیا میں یہ دونوں نظریات گذشتہ صدی کی تیسری دہائی میں تقریباً ایک ساتھ سامنے آئے۔انکی ابتدا 1924ء میں اس وقت ہوئی جب واشنگٹن میں سائنسدانوں کی کانفرنس میں ایک غیر حاضر ماہر فلکیات کا لکھا ہوا مقالہ پڑھا گیا جس میں سنسنی خیز انکشاف کیا گیا تھا کہ ہماری کائنات پھیل رہی ہے یہ مقالہ کیلی فورنیا کے ایک سابق باکسر اور بعد کے ماہر فلکیات ایڈون ہبل کا مرتب کردہ تھا اس وقت تک کائنات کو ایک جامد اور ابدی شے سمجھا جاتا تھا نیز اسے صرف ملکی وے تک محدود تصور کیا جاتا تھا خود ملکی وے کو کہکشاں کے بجائے ایک چپٹی تشتری کہا جاتا تھا اسکے پڑوس میں Andromeda (Messier 31) کو محض ایک چمکدار گیس کا بادل تصور کیا جاتا تھا لیکن ہبل نے جب اپنی سو انچ قطر والی طاقتور دوربین کا رخ اینڈرومیڈا کی طرف پھیرا تو وہ خود حیران رہ گیا کہ یہ محض گیس کا بادل نہیں بلکہ بے شمار ستاروں کا سمندر ہے اس موضوع پر بعد میں مزید تحقیقات سے کہکشاں کا تصور سامنے آیا ہے اور 1929ء میں جب ہبل نے اپنے مشاہدات کو شائع کر کے ثابت کر دیا کہ کہکشائیں ایک دوسرے سے دور جا رہی ہیں تو اس دریافت نے بگ بینگ یعنی کائنات کی ابتداء کا تصور دیا یعنی اگر کہکشائیں ایک دوسرے سے دور ہٹ رہی ہیں تو یقیناً ماضی میں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہوں گی۔

ایڈون ہبل نے دراصل اس نظریے کو عملی لحاظ سے ثابت کیا تھا جسے ایک روسی سائنس دان ڈاکٹر فرائڈ نے 1922ء میں پیش کیا تھا سٹیفن کے مطابق فرائڈ مین کے تمام انکشافات ایک خاصیت رکھتے ہیں کہ ماضی میں کسی وقت بھی (دس بیس عرب سال پہلے کے

دوران) پڑوسی کہکشاؤں کے درمیان فاصلہ ضرور صفر ہوا ہوگا۔ اس وقت جسے ہم عظیم دھما کہ یعنی BIG BANG کہتے ہیں کائنات کی کثافت اور مکاں وزماں کا خم لامتناہی ہوگا (بریف ہسٹری آف ٹائم) سٹیفن اسکی مزید وضاحت یوں کرتے ہیں کے

Hubble observations suggested that there was a time called the big baing when the universe was infinitesimmally small and infinitely dense. Under such conditions all the laws of science and therefor all ability to predict the future would break down (Tbid Page 9)

وسعت کائنات کے انکشاف پرانکا تبصرہ یہ دریافت کہ کائنات پھیل رہی ہے بیسویں صدی کے عظیم فکری انقلابات میں سے ایک تھی بعد ازاں اس پر حیران ہونا آسان ہے کہ پہلے کسی نے یہ کیوں نہیں سوچا۔ نیوٹن اور دوسروں کو یہ سمجھنا چاہیئے تھا کہ ایک ساکن کائنات قانون تجاذب کے تحت فوراً ہی سکڑنا شروع ہو جاتی ہے (ایظا'' صفحہ 42) کائنات کے پھیلاؤ میں یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ پھیلاؤ صرف خلاء میں ہو رہا ہے ایک بار پھر سٹیفن

It is important to realize that the expansion of space does not affect size of material objects such as galaxies stars apple atoms or other objects held together by some sort of force. (grand design p 125)

مارکس شاؤن کا پھیلاؤ کے بارے میں خیال ہے کہ ہبل نے بے شک صدی کی ایک بڑی دریافت کی کہ کائنات پھیل رہی ہے یعنی کہکشائیں ایک دوسرے سے دور جارہی ہیں اور اگر کائنات پھیل رہی ہے تو یہ حقیقت ناگزیر ہو جاتی ہے کہ ماضی میں اس کی جسامت موجودہ سے بہت چھوٹی رہی ہوگی یقیناً ایسا لمحہ ہوا ہوگا جب ایک بہت بڑا دھماکہ ہوا ہوگا یہی کائنات کی پیدائش کا لمحہ ہے (After Glow of Creation)

اوپر جس شعاع (Radiation) کا ذکر ہوا ہے اسکی پیشن گوئی روس کے ایک بڑے سائنسدان جارج گیمو نے دیگر دو سائنسدانوں سے مل کر کی تھی اس غیر معمولی پیشن گوئی کے مطابق کائنات کی بہت گرم ابتدائی حالت سے خارج ہونے والی شعاع کاری (فوٹون کی شکل میں) اب بھی موجود ہونی چاہیئے مگر اس کا درجہ حرارت کم ہو کر مطلق صفر (‎-273 C‎) سے چند درجے اوپر ہوگا ان شعاؤں کی 1965ء میں زمین پر اور 1992ء میں خلا میں دریافت کے بعد بگ بینگ نظریے کی واضح تصدیق ہوگئی روسی سائنسدان گیمو نے پہلی دفعہ ایک گرم بگ بینگ کا تصور دیا

بگ بینگ کی اصطلاح برطانوی ماہر فلکیات فریڈ ہائل نے عظیم دھماکے کا تمسخر اڑانے کے لیے واضح کی تھی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ مذاقاً وضع کی گئی اس اصطلاح پر ہی اس دھماکے کا نام پڑ گیا۔ دراصل فریڈ ہائل نے 1948ء میں بگ بینگ کے خلاف Steady State کا نظریہ پیش کیا تھا جس کے مطابق کائنات کی کوئی ابتدا نہیں کیوں کہ یہ ابدی اور ازلی ہے مارک شاؤن لکھتے ہیں :۔

For the next decade and half it was two horse race between the big bang theory and steady state theory But early 1960 the big bang theory was nosing ahead (Ihbid page 2)

سٹیفن کا بھی یہی خیال ہے کہ 1965ء میں پنیز یاس اور ویلسن کی مائیکرو ویو ریڈیائی لہروں کی دریافت نے بھی نشان دہی کی کہ کائنات ماضی میں ضرور کہیں زیادہ کثیف رہی ہوگی اس لیے Steady State نظریے کو ترک کرنا پڑا (بریف ہسٹری)

بگ بینگ کے ضمن میں اگر جارج ہنری لیماٹائر کا تذکرہ نہ ہو تو بحث ادھوری رہ جاتی ہے بلجیم کے اس پادری ماہر فلکیات نے پہلی دفعہ وسعت پزیر کائنات کی طبیعاتی نوعیت اور اسکی ابتدا کے بارے میں تحقیقات کیں اس نے 1927ء میں پھیلتی ہوئی کائنات کے جدید نظریات پہ ایک مقالہ شائع کیا تھا جس میں اس نے ثابت کیا تھا کہ آئن سٹائن کی مساوات میں Expanding universe کا طبیعاتی مواد موجود ہے یہ حقیقت میں ایک انقلابی نظریہ تھا کیوں کہ آئن سٹائن نے خود وسعت پذیر کائنات کے نظریے کو نظرانداز کر کے اپنی مسادات میں Cosmological Constant کی اصطلاح وضع کر کے اپنی تھیوری میں تبدیلی کر دی تھی اسی لیے اپنی پہلی ملاقات میں آئن سٹائن نے لیماٹائر کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی آئن سٹائن نے انہیں کہا کہ برخوردار!

your calculation are correct but your grasp of physics is abominable.

ایک بہت بڑے سائنسدان کے ایسے حوصلہ شکن تبصرے سے بھی انہوں نے ہمت نہیں ہاری پانچ سال کے بعد دوسری ملاقات میں آئن سٹائن انکی سائنسی خدمات کے قائل ہو گئے اور انکی سائنسی تحقیقات کے متعلق کہا

This is the most beautiful and satisfactory explanation of creation which I have ever listened.

ایڈون ہبل نے کائنات کے پھیلاؤ میں یہ بھی وضاحت کی ہے کہ کوئی کہکشاں جتنی ہم سے دور ہوگی اتنی ہی اس کی رفتار زیادہ ہوگی لیکن ابدی اور سکونی کائنات کا صدیوں پرانا تصور اتنا خوبصورت خوش کن اور وجد آفرین تھا کہ اکثر سائنسدان ہر حال میں اسے برقرار رکھنے کے خواہاں تھے آئن سٹائن کی مثال اوپر دی جا چکی ہے لیکن اس بارے میں ابھی ایک حیران کن انکشاف باقی ہے اور وہ یہ کہ خود ہبل بھی

جامد کائنات پر یقین رکھتا تھا۔۔وہ کیسے؟ دیکھئے!

When hubble published the 1929 paper giving a distance velocity relation for galaxies he cited Frieds work but forgot the belgian priests even though they had met many times. Hubble himself did not believe in an expanding universe. To him red shifts always remained the motion of glaxies not the signature of expanding pace.

لیماٹائر کے استاد سر آرتھر ایڈیگنٹن پر بھی ابتدا کائنات کا تصور نا گوار گزرتا تھا بعد میں آہستہ آہستہ ان سائنس دانوں نے تسلیم تو کرلیا لیکن ان کے فلسیفانہ نتائج کو ہضم کرنا ان کے لیے آسان نہیں تھا خود ایڈنگٹن کے بارے میں ہے کے

In 1931 Eddington himself wrote That Philosophically the notion of a beginining of the present order of nature is repugnant. Lamatire did not adhere..... Eddington's aversion. He offered the solution At the origin all the mass of the universe would exist in the form of a unique atom ___ The cosmose was born he argued, on a day without yesterday.

لیماٹائر نے نہ صرف بگ بینگ پر تحقیقات کی بلکہ اس نے بلیک ہول کے متعلق بھی کچھ نتائج اخذ کئے

He also derived fundamental reseults concerning what we now call black holes much later others notably Stiphen hawking picked up on this work.

(نوٹ لیماٹائر کے متعلق معلومات اور دیگر اقتسا بات امریکہ کے ماہنامہ Astronimy Nov, 2007 سے لیے گئے ہیں)

سٹیفن ہاکنگ نے بگ بینگ پر بڑی مفید اور اہم تحقیقات کی ہیں لیکن ابتدائے کائنات کے بارے میں باقی سائنسدانوں سے وہ زرا مختلف تصور رکھتے ہیں مثلاً نظریہ اضافیت کے مطابق کائنات بگ بینگ کی اکائیت پر لامتناہی کثافت سے شروع ہوئی سنگولیرٹی پر عمومی اضافیت اور دوسرے تمام قوانین ناکارہ ہوجاتے ہیں اور مستقبل کے بارے میں پیشن گوئی کرنی ممکن نہیں ہوتی پہلے سٹیفن کا خیال تھا کہ سینگولیرٹی یقیناً واقع ہوئی ہے لیکن بعد میں انہوں نے اکائیت کے بارے میں اپنا موقف بدل دیا تھا خود انکے مطابق 1970ء میں میرا اور پین روز کا ایک مشترکہ مقالہ شائع ہوا تھا جس میں ثابت کیا گیا تھا کے بگ بینگ ضرور ہوئی ہوگی بہ شرط یہ کہ عمومی اضافیت

درست ہو اور کائنات میں اتنا مواد موجود ہو جسکا مشاہدہ ہم کر سکتے ہوں ہمارے اس کام کی بڑی مخالفت ہوئی ۔۔۔ بہر حال ایک ریاضاتی قضیے سے محبت نہیں کی جا سکتی اس لیے ہمارا کام عام طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا اور اب ہر شخص سمجھتا ہے کہ کائنات بگ بینگ اکائیت سے شروع ہوئی ہے یہ شاید عجیب بات ہے کہ اب میں خود اپنی سوچ بدل کر دوسرے ماہرین طبعیات کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ در حقیقت کائنات کے آغاز میں اکائیت نہیں تھی (بریف ہسٹری آف ٹائم صفحہ 54) دوسری جگہ وہ اپنا موقف یوں بیان کرتے ہیں

However I now think that although there is a singularity in the laws of physics can still determin how the universe begin (Black Holes page 83)

آغاز کائنات پر اپنے موقف کے حق میں انہوں نے کچھ اصطلاحات کا حوالہ بھی دیا ہے جن میں ایک فرضی وقت کی اصطلاح بھی شامل ہے وہ کہتے ہیں کہ حقیقی وقت میں تو کائنات کی ابتداء ہے لیکن فرضی وقت میں کائنات متناہی نیز حدوں کے بغیر ہو جاتی ہے اس لیے اس کی کوئی ابتداء نہیں (بریف ہسٹری صفحہ 147 اور بلیک ہول صفحہ 158) وہ اسکی مزید وضاحت کرتے ہیں۔

The Universe really is in such a quantum state, there would be no singularity in the history of the universe in imaginary time. (Brief History page 147)

کیتھولک چرچ کی ایک میٹنگ میں اپنے ایک لیکچر کے بعد پوپ سے ملاقات کا تذکرہ یوں کرتے ہیں کے پوپ نے بتایا کہ بگ بینگ کے بعد کائنات کا مطالعہ تو ٹھیک ہے مگر ہمیں خود بگ بینگ کی تفتیش نہیں کرنی چاہیے کیوں کے یہ تخلیق کا لمحہ تھا اور اسی لیے خدا کا عمل تھا (وہ فرضی وقت کو حقیقی اور حقیقی کو فرضی وقت کا درجہ دیتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ معروف فرضی وقت بھی دراصل حقیقی وقت ہو اور جسے ہم حقیقی وقت کہتے ہیں وہ محض ہماری تصوراتی اختراع ہو (بریف ہسٹری صفحہ 147) وقت کی ایسی تقسیم ان سے پہلے برگساں نے بھی کی تھی اس نے حقیقی وقت کو زماں متسلسل اور فرضی وقت کو استدام (Duration) کا نام دیا تھا علامہ اقبالؒ نے اس موضوع پر اپنے دوسرے خطبے میں سیر حاصل بحث کی ہے لیکن سٹیفن کی طرح کسی نے بھی فرضی وقت کو طبعیات میں اپنے کسی موقف کے حق میں عملاً استعمال نہیں کیا اسی طرح انہوں نے کائنات کی ابتداء یا سینگولیرٹی کو نظر انداز کرنے کے لیے۔۔۔ Boundary Condition اور Sume over histories کی اصطلاحات سے بھی کام لیا ہے مختصر الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ افلاطون، ارسطو اور ان سے پہلے کے مادئین Materialists یونانی فلسفہ کی طرح سٹیفن بھی ابتداء

کائنات کو عام معنی میں ممکن نہیں سمجھتے۔ دراصل وہ Singularity کو تسلیم نہیں کرتے اور اپنے اس موقف میں وہ فرضی وقت کا حوالہ دیتے ہیں۔

اسی بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ اگر کائنات واقعی ایسی قوانٹم حالت میں ہے تو فرضی وقت میں کائنات کی تاریخ میں کوئی اکائیت نہیں ہوگی چنانچہ یوں لگتا ہے کہ میرے حالیہ کام نے اکائیتوں پر میرے پرانے کام کے نتائج کو بے کار کر دیا ہے مگر جیسا کہ اوپر نشان دہی کی گئی ہے اکائیوں کی تھیوریز کی اصل اہمیت یہ تھی کہ انہوں نے دکھایا تھا کہ Gravitational Field کو اتنا طاقت ور ہونا چاہئے کہ قوانٹم Gravitational اثرات کو نظرانداز نہ کیا جاسکے اس کے نتیجے میں یہ تصور سامنے آیا کہ کائنات فرضی وقت میں متناہی ہوسکتی ہے مگر حدوں اور اکائیوں کے بغیر حقیقی وقت میں جس میں ہم رہتے ہیں اگر واپس آجایا جائے تو پھر اکائیوں کا گمان ہوگا (بریف ہسٹری آف ٹائم صفحہ 147)

سٹیفن ہاکنگ (.A.L.S) یا موٹر نیورون کے مرض کی وجہ سے تقریباً معذوری کے باوجود اتنے باہمت اور حوصلہ مند ہیں کہ موجودہ دور کے ایک بڑے نظریاتی ماہر طبعیات (Theoritical Physicist) ہیں 1985ء میں ایک آپریشن کے دوران ان کی قوت گویائی بھی سلب ہوگئی تھی اب ایک انتہائی پیچیدہ کمپیوٹر کے انتہائی پیچیدہ نظام میں نصب ایک آلے کے ذریعے اپنی آواز کو دوسروں تک پہنچاتے ہیں وہ کیمبرج یونیورسٹی میں ریاضی کے Locasion پروفیسر رہے ہیں یہ وہ عہدہ ہے جو پہلے نیوٹن اور ڈائراک کے پاس رہ چکا ہے ابھی حال ہی میں ریٹائر ہوئے ہیں۔ بیوی سے علیحدگی ہوچکی ہے اولاد میں دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے پوپ، چرچ یا عیسائیت بلکہ کسی مذہب کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ہیں مگر موقع بے موقع مذہب کا اپنی تحریر میں حوالہ ضرور دیتے ہیں۔ غالباً ایک ماہر فلکیات فریڈ ہائل کا قول ان پر صادق آتا ہے انہوں نے کہا تھا مجھے یہ ہمیشہ عجیب سا لگتا ہے کہ بیشتر سائنسدان مذہب سے پہلو تہی کرتے ہیں لیکن یہ ان کے اعصاب پر پیشہ ور مذہبی لوگوں سے بھی زیادہ سوار رہتا ہے (Mind of God)۔ میں نے اپنے گاڈ پارٹیکل اور قرآن والے مضمون میں مریخ پر اترنے والی گاڑی کا حوالہ دیا تھا اب اس نے مریخ کی سطح کے بارے میں اطلاع دینی شروع کر دی ہے۔ پچھلے دنوں اس کے روبوٹ کو ایسے پتھروں کے قریب سے گزرتے ہوئے دیکھا یا گیا ہے کہ جن کی حالت سے سائنسدانوں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ مریخ کی سطح پر ماضی میں کسی وقت پانی گزرا ہے۔ دوسری خبر یہ ہے کہ ناسا کی خلائی گاڑی نے اپنا مشن مکمل کر لیا ہے اور اب ایک نمائشی نچلی پرواز کے بعد اسے عجائب گھر میں رکھ دیا گیا ہے۔

غلام احمد پرویز

قرآن اور شاعری

شاعری کیا ہے

آپ نے دیکھا ہے کہ مخالفین حضورؐ کے متعلق یہ بھی کہتے تھے کہ آپ ایک شاعر ہیں اس لئے آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ حقیقت پر مبنی نہیں اور نہ ہی اس قابل کہ اس پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔ قرآن کریم نے اس کی تردید کی اور فرمایا کہ

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ (36:69)

اور (دیکھو) ہم نے محمد کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ ہی شاعری اس کے لئے مناسب ہو سکتی ہے یہ (کتاب) اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ (پیامِ حق کی) یاددہانی اور واضح قرآن ہے۔

یعنی یہ کہ آپ شاعر نہیں اس لئے کہ شاعری ایک پیغمبر کی شایانِ شان ہی نہیں۔ اس سے بظاہر مترشح ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے شعروشاعری کی سخت مخالفت کی ہے اور اسے مسلک پیغمبری کے خلاف قرار دیا ہے۔ قرآن کی آیات سے یہ استنباط وضاحت طلب ہے۔

زبان، اظہار مدعا کا ذریعہ ہے اور نوعِ انسانی کے لئے بہت بڑا امتیاز۔ اس اظہار مدعا کے لئے انسانوں نے دو انداز اختیار کئے ہیں۔ ایک تو وہ جس میں روزمرہ باتیں کرتے ہیں۔ اسے نثر کہتے ہیں۔ دوسرے شعر۔ شعر کیا ہے؟ نثر کے الفاظ کو ایک خاص ترتیب میں رکھ دیا جاتا ہے اس اعتبار سے نثر اور نظم، الفاظ کی ترتیب کے دو مختلف اسلوب ہیں۔ قرآن کریم جو زندگی کے حقائق پیش کرتا ہے ایسی نیچی سطح پر نہیں اتر سکتا کہ ان دو اسالیب بیان میں سے ایک کی ایسی مذمت کرے کہ وہ کسی بلند شخصیت کے شایان شان ہی نہ رہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جب قرآن نے یہ کہا ہے کہ شاعری رسول کے شایانِ شان نہیں تو اس سے مقصود الفاظ کی وہ خاص ترتیب نہیں جس سے شعر موزوں ہو جاتا ہے بلکہ ایک خاص نفسیاتی کیفیت ہے۔

شاعر کی نفسیات

جسے اس نے ''شاعری'' سے تعبیر کیا ہے۔ یہ نفسیاتی کیفیت یا مسلک حیات کیا ہے؟ اس کی قرآن نے خود ہی دوسرے مقام پر تشریح کر دی ہے۔ قرآن کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ انسانی زندگی کا ایک خاص نصب العین ہے اور اس نصب العین کا حصول اس کی تمام جدوجہد کا مقصود۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اس کے نزدیک سفرِ زندگی میں منزل کی تعیین کا نام ہے۔ ایمان اور اس منزل تک پہنچنے کی

کوششوں کا نام اعمال صالحہ۔ یہ ایمان وعمل کی زندگی اس کے نزدیک انسانیت کی زندگی ہے۔ لہٰذا ایک مؤمن کی زندگی اور رسول کے شایانِ شان اسلوبِ حیات۔ اس کے برعکس ایک دوسرا اسلوبِ زندگی ہے جس میں نہ انسان کی آنکھوں کے سامنے صحیح نصب العین ہوتا ہے نہ دل میں اس نصب العین کے حصول کی تڑپ۔ اس کے جذبات اس کا معبود ہوتے ہیں اور ان کی تسکین اس کی زندگی کا منتہیٰ۔ یہ جذبات اس کی ناک[1] میں نکیل ڈالے اسے زندگی کی مختلف شاہراہوں پر ادھر ادھر لئے پھرتے ہیں۔ کبھی تصورات کی ان حسین وادیوں میں کبھی تخیلات کے اُن نگاہ فریب مناظر کی طرف۔ چونکہ زندگی کا نصب العین متعین نہیں ہوتا اس لئے آج جذبات کی رو میں کچھ کہہ رہے ہیں کل کچھ اور۔ جس قسم کا جذبہ دل میں موجزن ہوا اسی قسم کی آواز زبان پر آ گئی۔ چونکہ جذبات کے اظہار کے لئے شعر کی زبان زیادہ موزوں سمجھی گئی ہے اس لئے جذبات پرستی کی اس نہج زندگی کا نام قرآن نے شاعری رکھا ہے جو ایک مومن کی زندگی کے بالکل برعکس زندگی ہے۔ یہ دو مختلف اسالیب حیات ہیں جن کا تقابل قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

وَالشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ○ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ یَّهِیْمُوْنَ○ وَاَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ (26:224-226)

اور شاعروں کی پیروی ہمیشہ گم کردہ راہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ (اے پیغمبر!) تم نے دیکھا نہیں کہ وہ (روز) ہر (نئی) وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں؟ اور یہ کہ یہ لوگ وہ باتیں کہتے ہیں جو خود کرتے نہیں ہیں؟

یعنی نہ ان کا فکر صحیح مرکز متعین ہے اور نہ ان کے قول اور عمل میں تطابق۔ یہ ہے نفسیاتِ شاعر اور وہ اسلوبِ حیات جس کی خصوصیت پریشانئ فکر ونظر، آوارگئ قلب ونگاہ اور فقدانِ عمل وکردار ہے اس کے برعکس ایک دوسرا اندازِ حیات ہے جس میں زندگی کا نصب العین متعین ہے اور انسان کا ہر قدم اس نصب العین کی طرف اٹھتا ہے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ (26:227)

(وہاں) سوائے ان لوگوں کے جو (پیغام حق پر) یقین لے آئے ہیں اور جنہوں نے نیک کام کئے اور اللہ کو بہت یاد کیا اور اس کے بعد کہ ان پر ظلم کیا جا چکا انہوں نے اپنی مدافعت کی (یہ لوگ ایک متعین راستہ پر چلنے والے اور گفتار وکردار میں یکساں ہوتے ہیں) اور جن لوگوں نے (ان پر) ظلم کیا ہے وہ بہت جلد معلوم کر لیں گے کہ کس منزل کی طرف وہ پلٹ رہے ہیں۔

سورۂ شعراء کی ان آیات کے دونوں حصوں کو ایک مرتبہ پھر دیکھئے ان کے درمیان جو اِلَّا (مستثنیٰ) آیا ہے اس سے یہ مراد نہیں کہ ''مسلم

---

1. اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (45:23; 25:43)

(اے پیغمبر!) تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جنہوں نے اپنے خیالات ہی کو اپنا معبود بنالیا ہے۔

شعراء'' ہدایت وسعادت کی راہ پر ہیں اس لئے قرآن کے نزدیک محبوب ومرغوب اور''غیر مسلم شعراء'' ضلالت وغوایت پر ہیں اس لئے مغضوب ومبغوض۔ مفہوم اس سے یہ ہے کہ جولوگ اوّل الذکر انداز زندگی اختیار کئے ہوئے ہیں وہ غلط روش پر جارہے ہیں .... لیکن جودوسرا انداز اختیار کئے ہیں وہ صحیح راستے پر چل رہے ہیں۔قرآنی انداز زندگی اختیار کرنے والا اپنے مدعا کا اظہار نظم میں بھی کرے تو جائز اور درست۔غیر قرآنی اسلوب حیات اختیار کرنے والا اپنا مفہوم نثر میں ادا کرلے تو بھی غلط۔قرآن اسالیب زندگی سے بحث کرتا ہے۔ نہ کہ طرق اظہار مدعا سے۔لہٰذا قرآن نے جب ''شاعری'' کوغوایت کی راہ کہا ہے تو اس سے مفہوم وہ نفسیاتی کیفیت ہے جوانسان کوغلط روش زندگی پر لے جاتی ہے اور فکروعمل کی دنیا میں کہیں کا نہیں رکھتی۔

مسلمان شاعروں کی قوم بن چکی ہے

یہی وہ ''شاعری'' ہے جوایک مدت سے مسلمانوں کے ہر شعبۂ حیات پر مستولی ہے اوران کی کسی کوشش اور تحریک کو باریاب نہیں ہونے دیتی۔اگران کی باتیں سنئے توایسا معلوم ہوگا گویاایک سیلاب امنڈتا چلا آرہا ہے جودنیا کی ہرقوت کوخس وخاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا۔اور جب عمل کی طرف آئیے تو یہ حالت کہ ادنیٰ سے ادنیٰ چوکھٹ پربھی سجدہ ریزی کے لئے تیار۔اجتماعات قومی میں ان کے ریزولیوشنز کے الفاظ سے ان کے عزائم کا اندازہ لگایئے توایسا معلوم ہوگا' گویا یہ لوگ ؏ سمندر پھاڑ دیں گے۔کوہ سے دریا بہادیں گے۔

اورانہیں ان کے کردار کے ترازو میں تولئے تو ایک پرِکاہ ثابت ہوں گے۔ جسے ہوا کا ہلکا سا جھونکا اڑائے اڑائے پھرے۔ جذبات کی شعلہ مزاجی کا یہ عالم کہ ذرا سے اختلاف پرنعل برآتش ہوجائیں گے لیکن عدم استقلال کی یہ کیفیت کہ بگولے کا سا یہ تمام رقص دوجدادر جوش وخروش آن کی آن میں خاک نشین ہوجائے گا۔ یہ تو ہے دنیائے عمل واستقامت میں ان کی حالت۔دوسری طرف پریشانیٔ فکرونظر کا یہ عالم کہ ہرٹولی کا قبلۂ مقصود الگ اور ہرگروہ کا کعبۂ مدعا جداگانہ۔ چار اس کے پیچھے مصروفِ دشت پیمائی۔ دس اس کے ساتھ مشغول صحرانوردی۔ ہرگروہ فی کل واد یھیمون کی عبرتناک تصویراور ہرجماعت یقولون ما لا یفعلون کا تاسف انگیز مرقع۔اوراس طرح پوری کی پوری قوم اس ''شاعری'' کا عملی پیکر جس کی قرآن نے یوں مذمت کی ہے' لیکن بایں ہمہ یوں فریب میں مبتلا کہ یہ مذمت دوسروں کی کیگئی ہے ہماری نہیں' اس لئے کہ ہم توالا الذین امنو وعملوا الصلحت کے استثنا میں آگئے ہیں۔

خدا ایں سخت جاں را یار بادا
کہ افتاد است از بامِ بلندے

آیۂ زیرنظر کے آخری ٹکڑا پرایک مرتبہ پھرنگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ وہ صاحب ایمان وعمل گروہ کوفقط باتیں بنانے والوں سے کس

طرح متمیز کر کے رکھ دیتی ہے، بایں نمط کہ کسی دیکھنے والے کو ان میں امتیاز کی دشواری ہی پیش نہ آئے۔ دونوں گروہ ایک دوسرے سے الگ کھلے کھلے اور واضح طور پر متمیز۔ اس گروہ کی خصوصیات میں فرمایا کہ

(1) واذکروا اللہ کثیرا — وہ اللہ کا ذکر کثرت سے کرتے ہیں

(2) وانتصروا من بعد ما ظلموا — جب ان پر کسی طرف سے دراز دستی ہو تو وہ اس کی مدافعت کرتے ہیں

(3) جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وسیعلم الذین ظلموا امی منقلب ینقلبون۔ ظلم کرنے والوں کو فوراً نظر آ جاتا ہے کہ ان کا کیا حشر ہونے والا ہے۔

''اللہ کا ذکر'' کس طرح کیا جاتا ہے، اس سے مراد خانقاہوں کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں، سر بزانو، ہزار ہزار دانوں کی تسبیح پر زبان سے اللہ کا نام دہراتے رہنا اور عملاً ہر طاغوتی قوت کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر قانع رہنا نہیں بلکہ دنیا سے غیر خدائی قوتوں کے غلبہ واستیلاء کو مٹا کر اس کی جگہ حکومتِ خداوندی کو قائم کرنا ہے''۔ اس کی عملی تفسیر یوں ہوگی کہ دنیا میں جہاں کہیں جور و تعدی اور ظلم و ستم برپا کرنے والی سرکش قوتیں سر اٹھائیں گی ''اللہ کا ذکر'' کرنے والے مجاہدین اٹھیں گے اور حق و صداقت اور عدل وانصاف کی مدافعت میں، ہتھیلیوں پر سر لئے میدان عمل میں نکل آئیں گے اور ان طاغوتی قوتوں کو کیفر کردار تک پہنچا دیں گے۔ یہ ہے نشانی اس جماعت کی جسے قرآن نے ''شاعروں کے گروہ'' کے مقابلہ میں امتیازی طور پر پیش کیا ہے۔ اب آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ قرآن کی زبان میں ''شاعر'' کسے کہتے ہیں اور وہ کیوں اس قابل نہیں کہ اس کی اتباع کی جائے۔ مومن شاعری نہیں کرتا۔ کام کرتا ہے:۔

ما بمیداں سر بجیب، او سر بکف

اس کی تو شان یہ ہے کہ

جانِ او پائندہ تر گردد ز موت — بانگ تکبیرش بروں از حرف و صوت
پادشاہاں در قباہائے حریر — زرد رو از سہمِ آں عریاں فقیر
کارِ ما وابستۂ تخمین و ظن — او ہمہ کردار و کم گوید سخن!

اس لئے۔

محرمِ او شو ز ما بیگانہ باش
خانہ ویراں باش و صاحب خانہ باش

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
azureabbas@hotmail.com
www.azharabbas.com

اقامتِ دین کی قرآنی اساس اور اس کے ثمرات

قرآنِ کریم کی رُو سے انبیاءِ کرامؑ کی بعثت کا مقصد وحید دین کو قائم کرنا ہوتا تھا۔ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (42:13)- (ہم نے تمام انبیاء کو حکم دیا کہ) اس دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ پیدا نہ کرو۔ تمام انبیاء کرام نے اسی دین کے قائم کرنے کی کوشش کی اور انہوں نے اس دین کو قائم بھی کیا۔ حضور ﷺ کی ذاتِ مبارکہ پر چونکہ نبوت کا سلسلہ بند کر دیا گیا' اس لئے یہ اہم فریضۂ خداوندی جو انبیاء کرام کے سپرد تھا' اب یہ امتِ مسلمہ کے اوپر از خود فرض ہو جاتا ہے۔ یہ فریضہ امت نے از خود اختیار نہیں کیا بلکہ چونکہ امتِ مسلمہ کتاب خداوندی اور انبیاء کرام کی وارث ہے' اس لئے یہ فریضہ خداوندی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم مسلمانون میں صدرِ اول سے لے کر آج تک کبھی بھی اس کی فرضیت پر کوئی اختلاف نہیں ہوا ہے۔ اس امت مسلمہ کے تمام فقہائے کرام اور علماء عظام کا اس بات پر اتفاق و اجماع ہے کہ دین کا قائم کرنا' ایک ایک مسلمان پر فرض ہے اور اس میں اختلاف کرنا کفر اور حرام ہے۔ سورۂ شوریٰ کی اس آیت کریمہ سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ دین کے قیام کا حکم گذشتہ تمام انبیاء کرام کو دیا گیا تھا۔ نزول قرآن کریم سے پیشتر انبیاء کرام کی طرف توریت نازل ہوئی تو اس وقت' توریت کی اقامت' اقامتِ دین تھا' توریت کے بعد جب انجیل نازل ہوئی تو اس دور میں' اقامتِ انجیل' اقامتِ دین تھا' چنانچہ ارشاد عالی ہوا: وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (5:66)- اگر یہ توریت و انجیل کو قائم رکھتے تو ان پر زمین و آسمان کی برکات کے دروازے کھل جاتے اور ہر طرف سے رزق کے چشمے ابلتے چلے آتے۔ (7:96, 7:40)- اب چونکہ قرآن کریم آخری وحی الٰہی ہے اور اس کے بعد مزید وحی کے آنے کا امکان ختم ہو گیا ہے اس لئے اب قیام قیامت تک' قرآنِ کریم کا نظام قائم کرنا ہی' اقامتِ دین ہے۔ اور اقامتِ دین میں قرآن کریم کے علاوہ انسانی خیالات یا کسی اور خارجی سہارے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔

سورۂ مائدہ میں ارشاد ہوتا ہے: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44)۔ اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ (احکامات) کے مطابق فیصلے نہیں کرتے' وہ کافر ہیں۔ یعنی کافر اور مسلمان ہونے میں اصل فرق یہی ایک واحد معیار ہے کہ جو مملکت قرآنِ کریم کے مطابق فیصلے کرتی ہے' اس کے باشندے مسلمان ہیں اور جو مملکت قانون خداوندی کے مطابق عمل ہی

نہیں کرتی‘ اس کے باشندے قرآنی مسلمان نہیں ہو سکتے‘ یہ بھی واضح رہے کہ قرآنی احکامات کے مطابق فیصلے کرنے کا دائرہ صرف سیاسی امور تک ہی محدود نہیں ہے‘ بلکہ اس میں معاشی امور بھی شامل ہیں(11:87)- قرآن کریم کے فیصلوں کا اطلاق اس قوم کی معاشیات پر بھی ہوتا ہے‘ جس رزق کی تقسیم وحی خداوندی کے مطابق نہیں ہوتی‘ اس رزق کا ایک ایک لقمہ حرام ہوتا ہے۔اس لئے بھی اقامت دین سے کوئی مفر نہیں ہوسکتا۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ (4:59)- یہ بات واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت رسول کی اطاعت کے بغیر نہیں ہوسکتی: مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (4:80)- جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے کے لئے‘ رسول کو درمیان میں ڈالنا لازمی چیز ہے۔رسول کو درمیان میں سے کسی طرح بھی نہیں نکالا جاسکتا۔ اللہ کی اطاعت کرنے میں جس طرح رسول اللہ ﷺ کا درمیان میں ہونا لازمی وضروری ہے‘ بالکل اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرنے کے لئے اولوالامر کی اطاعت بھی ضروری ہے(4:59)- تمام علمائے اسلام اور فقہائے عظام کا اس بات پر اجماع ہے کہ اولوالامر کی اطاعت فرض ہوتی ہے‘ یہ مقامی افسران ہوتے ہیں‘ قرآن کریم میں حکام کا لفظ بھی آیا ہے(2:188)- حضور ﷺ نے اپنے مبارک عہد میں مختلف شہروں وقصبوں میں اولوالامر وحکام کا مقرر کیا ہوا تھا حضور ﷺ کی مملکت دس لاکھ مربع میل پر وسیع تھی‘ حضور ﷺ کا قیام مدینہ منورہ میں تھا۔اس مبارک مملکت کے وہ باشندے جو مدینہ سے بہت فاصلے پر رہائش پذیر تھے‘ جب ان کے درمیان کوئی باہمی تنازع ہوتا تھا‘ تو وہ اپنے مقدمہ کا فیصلہ کرانے مدینے نہیں جاتے تھے۔وہ اپنے مقامی اولوالامر یا مقامی حاکم کے پاس جاکر‘ اپنے تنازع کا فیصلہ کرالیتے تھے۔مقامی حاکم‘ یا مقامی صاحبِ امر جو فیصلہ کرتا تھا فریقین کو اس فیصلے کو تسلیم کرنا ضروری ہوتا تھا۔اس فیصلے کی اطاعت ہی اطاعتِ رسول اور عبادت خداوندی ہوتی تھی‘ اگر یہ مقامی حاکم درمیان میں نہ ہو‘ تو رسول اللہ ﷺ کی اطاعت نہیں ہوسکتی تھی۔اطات کی یہ تین کڑیاں‘ اللہ کی اطاعت رسول کی معرفت اور رسول کی اطاعت اولوالامر کی معرفت‘ کسی طرح تبدیل نہیں ہوسکتیں۔اولوالامر کی اطاعت کرنے کے لئے اقامت دین فرض ہوتا ہے اولوالامر اسلامی مملکت کے مقامی افسران ہوتے ہیں۔قرآن کریم نے ان کے لئے ”منکم“ (تمہارے میں سے) کی شرط عائد کرکے واضح کردیا ہے کہ یہ مسلمان ہی ہوں گے‘ اور یہ زندہ اتھارٹی ہوں گے۔یہ اولوالامر گذشتہ زمانہ کے فوت شدہ لوگ نہیں ہوسکتے۔آج ہمارے دور میں نہ اسلامی مملکت ہے اور نہ ہی زندہ اولوالامر‘ اس لئے ہم عبادت خداوندی اور اطاعتِ رسول دونوں چیزوں سے محروم ہیں۔جو حضرات ہمارے ہاں اللہ کے فرمانبردار اور پرہیزگار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔وہ خود بھی غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور دوسروں کو بھی غلط فہمی میں مبتلا رکھنا چاہتے ہیں۔ہم مسلمان جو کچھ مذہب کے نام پر کرتے ہیں وہ صرف پرستش ہے۔اطاعت نہیں ہوتی۔ہم سارے دن میں پانچ وقت کی نمازیں پڑھنے کے لئے مسجد میں مشکل سے ایک گھنٹہ گذارتے ہیں جس میں ہم اللہ تعالیٰ کی پرستش کرتے ہیں۔اس کے علاوہ دن رات کے تئیس گھنٹوں میں ہم

انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی اطاعت کرتے ہیں، ہم اس دور کے مسلمان، پرستش اللہ کی کرتے ہیں اور اطاعت انسانی قوانین کی کرتے ہیں۔ دین اس لئے قائم کیا جاتا ہے کہ اس میں خالص اطاعت اللہ کی ہوتی ہے۔ کیونکہ دین میں خدا پرستی سے مقصود خدا کے قوانین کو دنیا میں عملاً نافذ کرنا ہوتا ہے اور نیک عملی کے معنے ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنا ہوتا ہے۔

قرآن کریم کی رُو سے خود کو مسلمان کہنا کافی نہیں ہے بلکہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اسلامی نظام قائم کرنے کی کوشش کرے۔ وہ اگر اپنے ملک میں اسلامی نظام کے قیام کے امکانات کو بالکل مسدود سمجھتا ہے تو اس پر فرض ہے کہ وہ اسلامی نظام والے ملک کی طرف ہجرت کر جائے جیسا کہ حکم خداوندی ہے: وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یُھَاجِرُوْا مَا لَکُمْ مِّنْ وَّلَایَتِھِمْ مِّنْ شَیْءٍ حَتّٰی یُھَاجِرُوْا (8:72)- یعنی جو لوگ ایمان تو لے آئے اور انہوں نے اپنے وطن سے ہجرت نہیں کی اور غیر اسلامی نظام (طاغوت) میں رہنا پسند کر لیا۔ تو ان سے کسی قسم کی رفاقت کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اقامتِ دین کا ہر مدعی، اپنی دعوت کو اسی مقام سے شروع کر دے جس جگہ وہ قیام پذیر ہے لیکن اگر وہ محسوس کرتا ہے کہ وہاں اسلامی نظام کے قیام کا امکان نہیں ہے تو وہ وہاں سے ہجرت کر جائے۔ غیر اسلامی نظام میں رہنے سے یہ بات لازم آتی ہے کہ اس غیر اسلامی نظام میں رہنے والا، اس نظام کی اطاعت کرے گا۔ غیر اسلامی نظام کی اطاعت ہی معصیتِ خداوندی ہے، غیر اسلامی نظام میں رہنے کی اجازت صرف دو حالتوں میں ہے، یا تو کوئی شخص اس غیر خدائی نظام کے اندر رہتے ہوئے، اسلامی نظام کے قیام کی کوشش کر رہا ہے تو بے شک وہ اس غیر اسلامی نظام میں رہ سکتا ہے اور یا اس کو اس نظام سے نکلنے کا کوئی بھی راستہ دستیاب نہیں ہے اور وہ اس معاملہ میں بالکل بے بس اور لاچار ہے۔ تب وہ اس نظام میں رہ تو سکتا ہے لیکن اس نظام کی اطاعت سے دل میں اکراہ ضرور محسوس کرتا رہے۔

غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرنے والے مسلمان اللہ و رسول کی اطاعت کر ہی نہیں سکتے کیونکہ اللہ و رسول کی اطاعت کے لئے لازمی ہے کہ اولوالامر کی اطاعت ہو۔ یہ اولوالامر صرف اسلامی حکومت کے مقامی افسران ہوتے ہیں۔ غیر اسلامی نظام کے حکام پر اولوالامر کی اصطلاح کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ جب قرآن نے اولوالامر کی اطاعت کو فرض قرار دیا ہے تو یہ خود بخود ایک نظام کی اطاعت ہو جاتی ہے۔ اس لئے اسلامی نظام کا قیام یا اقامت دین اور بھی ضروری و لازمی ہو جاتا ہے۔

سیکولر حکومتوں میں انسانوں کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہوتا ان کے خیال میں مشہور شاعر ذوق دہلوی کے مطابق

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

یہ دنیا چل رہی ہے۔ لہٰذا دنیا میں نہ کوئی مستقل اقدار ہیں اور نہ کوئی قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ سیکولر حکومت میں جس کام سے اپنی قوم کو فائدہ پہنچے وہ خیر ہے اور جس کام سے اپنی قوم کو نقصان ہوتا ہے وہ شر ہے، اس کے برخلاف قرآنِ کریم اسلامی مملکت کے مقاصد متعین

کرتا ہے اور وہ مقاصد ہی اس کی اساس ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا تو اس کو اس کے جسم کے ساتھ ایک ذات بھی عنایت فرمائی۔ یہ ذات ہی وہ اصل شے ہے جس سے انسان زندہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے مِنۡ رُّوۡحِہٖ (32:9) یا مِنۡ رُّوۡحِنَا (21:91) کہا ہے' ان مقامات میں یہ ترکیب مرکب اضافی نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے یہ روح اللہ تعالیٰ کا ایک حصہ قرار دی جائے بلکہ یہاں یہ اضافت' اضافتِ تعظیمی ہے۔ اضافت تعظیمی اس لئے ہوتی ہے کہ اس سے مصاف کو شرف وعزت دینا مقصود ہوتا ہے۔ جیسے قرآن کریم میں کعبہ کو بیتی (22:26, 71:28) میرا گھر کہا ہے۔ یہاں یہ گھر اللہ کی ذات کا جزو نہیں ہے بلکہ اس گھر کو عزت دینے کی وجہ سے اس کو بیتی کہا گیا ہے۔ نیز اس سلسلہ میں یہ بات بھی اہم ہے کہ خدا نے کہیں اپنے آپ کو روح نہیں کہا۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنی ذات کو روح سے تعبیر کرتا تو پھر روحہٖ اس کا ایک حصہ ہو سکتا تھا' لیکن قرآن نے ایسا نہیں کہا۔ انسان ہی اللہ تعالیٰ کی روح کا مظہر ہے۔ یہ ایک ایسی توانائی ہوتی ہے جس میں سوچنے' سمجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنی روح انسانوں میں پھونکتا تو ہر انسان میں تھوڑی سی الوہیت بھی آ جاتی لیکن ایسا نہیں ہے۔

انسانی ذات کو نشو ونما دینا انسان کا فریضہ ہے۔ یہ ذات ہر بچہ کے ساتھ پیدا ہوتی ہے اور اس میں نشو ونما کی صلاحیت ہوتی ہے۔ جس طرح بچہ کا جسم پیدائش کے وت بہت چھوٹا ہوتا ہے اور وہ آہستہ آہستہ بڑھتے بڑھتے کئی فٹ کا ہو جاتا ہے' اسی طرح یہ ذات انسانی (نفس) نشو ونما حاصل کرتی جاتی ہے' انسانی جسم کو طبعی قوانین Govern کرتے ہیں جبکہ ذات انسانی کی پرورش وحی الٰہی کے قوانین کے مطابق ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے انسان کی ذات کی پرورش کے طریقے خود متعین ومقرر فرمائے ہیں۔

(1) الَّذِیۡ یُؤۡتِیۡ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی (92:18)- جو اپنا مال دیتا ہے اس کا تزکیہ نفس ہوتا ہے۔

(2) وَ اَنۡفِقُوۡا خَیۡرًا لِّاَنۡفُسِکُمۡ ؕ وَ مَنۡ یُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ (64:16) - دوسروں پر خرچ کرو کہ اس سے تمہاری نفس کی بہتری ہوتی ہے اور جس شخص نے اپنے نفس کو حرص سے بچا لیا' تو ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں۔

(3) وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَلِاَنۡفُسِکُمۡ (2:272)- تم جو مال خرچ کرو گے' اس سے تمہارے نفس کی بہتری ہے۔

(4) وَمَنۡ تَزَکّٰی فَاِنَّمَا یَتَزَکّٰی لِنَفۡسِہٖ (35:18)-

(5) وَمَنۡ یَّبۡخَلۡ فَاِنَّمَا یَبۡخَلُ عَنۡ نَّفۡسِہٖ (47:38)-

اپنی آمدنی اور مال دوسروں پر خرچ کرنے سے تزکیہ نفس ہوتا ہے اور اصولی طور پر تزکیہ نفس کا طریقہ یہ ہے کہ جب ذاتی مفاد اور مستقل قدر میں مقابلہ آ پڑے تو ذاتی مفاد کو چھوڑ کر' مستقل قدر پر عمل کرنے سے نفس انسانی کا ارتقاء ہوتا ہے' اسلامی مملکت کی بنیاد ہی مستقل اقدار پر ہوتی ہے اور اس مملکت میں رات دن مستقل اقدار کا نفاذ ہوتا ہے' اس لئے اس مملکت میں نفس انسانی کی پرورش از خود ہوتی چلی جاتی ہے اور یہی اصولی نکتہ اسلامی مملکت کی قرآنی اساس ہوتا ہے۔

انسانی ذات پر اچھے یا برے اثرات مرتب ہوتے رہتے ہیں اور اسی طریقہ سے اس ذات کی نشوونما یا اس کا اضمحلال ہوتا رہتا ہے' چونکہ اسلامی حکومت کا ہر شہری اپنے نفس کی پرورش چاہتا ہے اس لئے وہ ایسے امور سے اجتناب کرتا ہے جس سے اس کی ذات پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ ناجائز مال کھانے' جھوٹ بولنے' دھوکہ دینے' عہد شکنی کرنے' کسی کو تکلیف پہنچانے' چوری' جوا' غبن جیسے امور سے اس لئے بچتا ہے کہ ان امور کے ارتکاب سے اس کا نفس مجروح ہوتا ہے' نفس کو ان جرائم سے بچانے کا By Product یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت میں جرائم بالکل کم ہو جاتے ہیں اور اس قرآنی اساس پر مملکت میں امن وسکون قائم رہتا ہے۔

جیسا کہ شروع مضمون میں عرض کیا گیا تھا کہ اسلامی نظام کے ثمرات میں سے ایک ثمر یہ ہوتا ہے کہ اس معاشرہ میں انسانوں کی ساری خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ حضور علیہ السلام کے منصب میں جس طرح کہ اقامت فرض تھا اسی طرح آپ کے ذمہ اس معاشرہ کے لوگوں کی صلاحیتوں کو نشوونما دینا بھی تھا۔ **وَيُزَكِّيهِمْ** (3:164, 2:129) ۔ایمان اور اعمال صالحہ کا لازمی نتیجہ صلاحیتوں کا بیدار ہو جانا ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے اعمال صالحہ کی کوئی خاص تعریف Definition بیان نہیں کی ہے اور نہ ہی اعمال صالحہ کی کوئی فہرست مرتب کر کے دی ہے۔ ہمارے ہاں عموماً پرستش کی رسوم' نماز' روزہ' حج وعمرہ کو اعمال صالحہ کہا جاتا ہے۔ لیکن نماز ہجرت سے چند ماہ قبل اور روزہ دو ہجری میں فرض ہوئے ہیں۔ جبکہ مکی آیات میں بھی **الذین آمنوا و عملو الصالحات** کے الفاظ بار بار دہرائے گئے ہیں جن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اعمال صالحہ ان سے الگ بھی تھے' قرآن نے اعمال صالحہ کی فہرست اس وجہ سے مرتب نہیں کی کہ مختلف اوقات میں اعمال صالحہ مختلف ہو سکتے ہیں' ہر وہ عمل جو کسی مقصد کو پورا کرنے کے لئے سرانجام دیا جائے وہ اس کا عمل صالح ہے' اگر آپ نے ایک پودا لگایا ہے اور آپ روزانہ اس کی نشوونما کے لئے اس میں پانی ڈالتے ہیں۔ یہ پانی ڈالنا عمل صالحہ ہے' اس کے برعکس اگر ایک چٹان سڑک کے درمیان میں واقع ہے جس سے راہ گذاروں کو بڑی دقت ہوتی ہے' لوگوں کی دقت و پریشانی دور کرنے کے لئے آپ نے ارادہ کیا کہ اس چٹان کو کاٹ کر راستہ صاف کر دیں' جب آپ اس چٹان کو کاٹتے ہیں تو یہ عمل' عملِ صالح ہے۔ مسلمان کا مقصد زندگی اقامتِ دین ہے' ہر وہ عمل جو اقامتِ دین میں معاون اور مددگار ہوتا ہے' وہ عمل صالحہ ہے۔ ہر وہ عمل جس سے یہ نظام قائم رہتا ہے اور ہر وہ عمل جس سے اس نظام کی اطاعت ہوتی ہے۔ عمل صالح ہے۔ ان اعمال سے انساں کی صلاحیتیں نشوونما پاتی ہیں اور اس سے معاشرہ کی ناہمواریاں دور ہوتی ہے۔

سیکولر معاشروں میں معاشرہ کو منظّم رکھنے کے لئے قانون بنائے جاتے ہیں۔ وہاں چوری' غبن' دھوکہ' لوٹ مار کو قانوناً اس لئے منع کیا جاتا ہے تا کہ معاشرہ میں امن وسکون بحال رہے۔ اسلامی نظام میں چوری اس لئے نہیں کی جاتی کہ چوری کے عمل سے چور کے نفسِ انسانی پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں' سیکولر معاشرہ میں لوگ Tax صرف اس لئے دیتے ہیں تا کہ حکومت کے عتاب سے محفوظ رہیں کیونکہ اگر وہ ٹیکس نہیں دیں گے تو حکومت مزید جرمانہ عائد کر دے گی۔ اسلامی حکومت میں ٹیکس اس لئے دیتے ہیں کہ اس

سے نفس کی نشوونما ہو کر ان کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔ اسلامی حکومت میں جو اعمالِ صالحہ سرانجام دیئے جاتے ہیں ان سے اصل مقصود تو انسان کی صلاحیتوں کی بیداری ہی ہوتا ہے' لیکن اس سے ضمنی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس معاشرہ میں از خود قوانین کی اطاعت ہوتی رہتی ہے اور اس میں جرائم بالکل ختم ہوتے جاتے ہیں۔ ہماری پیشوائیت اسلامی نظام کی برتری صرف یہ سمجھتی ہے کہ اس میں قرآنی اوامر و نواہی جاری ہو جاتے ہیں' لیکن اسلامی نظام کا اصل امتیاز یہ ہے کہ اس میں انسانی نفس کا تزکیہ ہو کر' انسانی صلاحیتوں کی بیداری ہو جاتی ہے اور یہ اوامر و نواہی ضمنی طور پر حاصل ہو جاتے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَ كَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (5:66)- اگر یہ تورات وانجیل کا نظام قائم کرتے تو ان پر آسمان وزمین کی برکات کے دروازے کھل جاتے اور ہر مقام سے رزق کے چشمے ابلتے۔ قرآنِ کریم کے نزول سے پیشتر توراۃ وانجیل کے مطابق قائم کردہ نظام اقامتِ دین تھا' نزولِ قرآن کے بعد قرآن کے قوانین پر قائم کردہ نظام اقامت دین ہے' رزق کی فراوانی کا وعدہ جس طرح اقامتِ توراۃ وانجیل کے لئے کیا گیا ہے' یقیناً یہ وعدہ قرآن کریم کے نظام کے ساتھ بھی کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد عالی ہے: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6)- اور زمین پر چلنے والوں میں کوئی ایسا نہیں جس کی روزی خدا کے ذمہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کی یہ ذمہ داری صرف اس کے نظام سے مخصوص اور وابستہ ہے' ورنہ آج اس دور میں جب اسلامی نظام قائم نہیں ہے ہزاروں آدمی رات کو بھوکے سوتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ وسائل رزق کی اب بھی کوئی کمی نہیں ہے' یہ جو بھوک اور افلاس ہے یہ صرف غیر منصفانہ تقسیم کی وجہ سے ہے جو غیر اسلامی نظام کے قیام کا منطقی نتیجہ ہے۔ غیر اسلامی نظام میں رزق کی صحیح تقسیم ہو ہی نہیں سکتی' انسانیت کا اہم ترین مسئلہ ہی یہ ہے کہ رزق کی تقسیم کے وہ کون سے اصول ہیں کہ جن کے مطابق رزق کی تقسیم اس طرح ہو جائے کہ تمام لوگوں کو رزق بھی مل جائے اور ان کی ذات کی نشوونما بھی ہوتی چلی جائے کہ ان کی تمام صلاحیتیں کام میں لائی جاسکیں۔ سیکولر نظام میں اس کا کوئی حل نہیں ہے' اسلامی مملکت اس مسئلہ کو انسانی ذات کی نشوونما پر منوط و منحصر کرتی ہے۔

اقامت دین کے ثمرات میں سے ایک قابل قدر ثمر مسلمانوں کا باہم اتفاق و اتحاد ہے۔ نزول قرآن سے پیشتر عرب کا ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کا دشمن تھا' ان میں باہمی جنگیں جاری رہتی تھیں' ان کے دیوتا الگ الگ تھے لیکن قرآن کریم نے ان کو ایک بنا دیا۔ وہ لوگ جو ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے وہ ایک دوسرے کے دوست اور غمخوار بن گئے۔ قرآن نے اس اتفاق و اتحاد کو ایک نعمت قرار دیا' اللہ تعالیٰ نے مومنین کی تالیف قلوب کو اپنی طرف نسبت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ خدا نے تمہارے دلوں میں محبت والفت پیدا کی۔ اس کی عملی تعبیر یہ ہے کہ ان کے مفادات اور اغراض و مقاصد کو ایک کر کے' اقامتِ دین سے وابستہ کر دیا۔ جب تک دین قائم رہا' ان میں اتفاق و اتحاد بھی قائم رہا۔ جس دن دین کا نظام ختم ہوا ان میں باہمی افتراق وانشقاق عود کر آیا۔ مسلمانوں میں اتفاق پیدا کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ان کے مقاصد زندگی میں ہم آہنگی پیدا کر دی جائے اور یہ ہم آہنگی اقامت دین کو مطمح نگاہ بنانے سے پیدا ہو سکتی ہے۔

آج ساری دنیا میں جو ظلم و فساد پھیلا ہوا ہے وہ صرف اس وجہ سے ہے کہ ہمارے تمام معاشروں میں عدل و انصاف ختم ہو گیا ہے قرآن کریم عدل و احسان پر بڑا زور دیتا ہے‘ اول تو یہ انسانوں کے وضع کردہ قوانین ہی عدل پر مبنی نہیں ہیں۔ان تمام ممالک کے قوانین ذاتی مفادات اور Expendiencies پر مبنی ہیں‘ ہر ملک کا قانون غریب کا استحصال کرتا ہے کسی ملک میں کسی اسمبلی میں جہاں قانون سازی ہوتی ہے‘ کبھی کوئی غریب یا کوئی کسان یا مزدور شامل نہیں ہوا ہے۔قرآن کریم قیام عدالت کی بار بار تاکید کرتا ہے‘ قرآن عدالت کی صرف نصیحت ہی نہیں کرتا‘ بلکہ اس کی نظر میں زیادہ اہم اس کا رائج ہونا ہے۔قرآن نے فرمایا: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (5:8) - کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اس سے عدل نہ کرو۔ عدل کرو کہ یہی تقویٰ کے قریب ہے۔دنیا کے کسی قانون یا کسی مذہب میں اس حکم کی نظیر نہیں مل سکتی۔کسی ایک قوم میں بھی یہ قانون رائج نہیں کہ مخالف قوم سے دشمنی نہ کرو بلکہ اس سے عدل کرو۔یہ قرآن کریم کا منفرد اور بڑا ہی قابل قدر قانون ہے۔اس حکم کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے‘ عدل کے بارے میں حضرت علی المرتضٰی کا مشہور قول ہے **الملک یبقیٰ مع الکفر ولا یبقیٰ مع الظلم** ۔ حکومت کفر سے تو ممکن ہے باقی رہ جائے لیکن اگر حکومت ظالم ہے تو اسے دوام حاصل نہیں ہو سکتا۔

اقامتِ دین کے ثمرات تو بے شمار ہیں۔اس کی معرفت اللہ کے وعدے پورے ہوتے ہیں۔اس نظام کی معرفت دعائیں پوری ہوتی ہیں۔دین کے قیام سے مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوتا ہے۔دین کے عروج و زوال سے مسلمانوں کا عروج و زوال وابستہ ہے۔سب سے بڑی اہم بات یہ ہے کہ اس کے ذریعے اللہ کی عبادت اور اس کے رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔اگر دین کا نظام قائم نہ ہو تو انسانیت عبادت الٰہی اور اطاعت رسول سے محروم رہتی ہے۔یہ نظام اپنے اندر اتنی صلاحیت رکھتا ہے کہ یہ اپنے حیات آور اور زندگی بخش نتائج پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا (13:35)-اس کے میوے سدا بہار اور ایسی ہی اس کی چھاؤں بھی۔ تُؤْتِىْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا (14:25)-وہ اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت اپنے پھل دیتا ہے۔قرآن کریم کو اسی وجہ سے محفوظ رکھا گیا ہے کہ جو قوم بھی‘ جس جگہ بھی اور جس وقت بھی اس کے مطابق نظام قائم کرے گی‘ وہ اس کے زندگی بخش نتائج سے معمور ہو جائے گی اور یہی نظام انسانیت کا آخری سہارا اور پناہ گاہ ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا (18:27)-اور تم اس کے علاوہ کہیں کوئی پناہ گاہ نہ پاؤ گے۔

اصل مضمون تو یہاں ختم ہو گیا جس کا مقصد اقامتِ دین کی فرضیت اور اس کے ثمرات کو بیان کرنا تھا۔مضمون کے درمیان میں ہم نے لیڈروں اور عوام کی ذمہ داری سے تعرض کیا تھا کہ معاشرے کے قیام اور اس کے زوال میں دونوں کی کتنی ذمہ داری ہوتی ہے۔اس بارے میں ایک اہم نکتہ ہم نے اس جگہ عمداً بیان نہیں کیا تھا کہ اس کو آخر میں بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا تھا۔آپ اس نکتہ کو ملاحظہ فرمائیں۔اگرچہ یہ قوم بنی اسرائیل کا ذکر ہو رہا ہے‘ لیکن یہ کس طرح ہمارے عوام اور لیڈروں کی عکاسی کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت حضرت موسیٰ فرعون اور اس کے اعیان کی طرف گئے اور فرعون کو دعوت دی کہ میں تمہارے پاس اللہ کا

رسول بن کر آیا ہوں (43:46)۔ جب حضرت موسیٰ اس کی طرف گئے تو اس نے ان کا مذاق اڑایا اور کہا کہ جب مصر کی بادشاہی، اس کے دریا اور نہریں میرے قبضہ میں ہیں تو یہ شخص جو ایک غلام قوم کا فرد ہے اور جو اپنی بات کھول کر بیان بھی نہیں کر سکتا۔ یہ مجھ سے بہتر کیسے ہو سکتا ہے۔ اس جگہ قرآن ایک بڑی معنی خیز بات بیان کرتا ہے، فرمایا: فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ (43:54)۔ غرض فرعون نے ان باتوں کے ذریعے اپنی قوم کو احمق بنایا اور لوگوں نے اس کی اطاعت کر لی بے شک وہ لوگ خود بھی فاسق تھے۔

باطل حکومتوں اور لیڈروں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ انہوں نے ہمیشہ عوام کی Brainwashing کی ہے۔ فرعون نے بھی ایسا ہی کیا۔ انہیں حقائق کے ادراک سے دور رکھا، فرعون کا یہ طریقہ یعنی لوگوں کو احمق بنانا اور ان کی عقل کو کم تر سمجھنا، ہمارے معاشروں میں جاری ہے۔ فرعون کے پاس تو بہت محدود وسائل تھے مگر آج باطل حکومتوں کے پاس ذرائع ابلاغِ عامہ، اخبارات، رسائل، ریڈیو، ٹی وی، کمپیوٹر اور طرح طرح کے ذرائع، عوام کو گمراہ کرنے کے لئے موجود ہیں تاکہ ان ذرائع سے لوگوں کو حقائق سے بے خبر رکھیں۔ لیکن آیۂ کریمہ میں جو آخری الفاظ آئے ہیں وہ بھی بڑے غور طلب ہیں۔ ان میں کہا گیا ہے کہ اس قوم نے فرعون کی اس لئے اطاعت کر لی کہ وہ قوم خود بھی فاسق تھی۔ یہاں فاسق کا لفظ فقہی معنوں میں استعمال نہیں ہوا بلکہ یہاں اس کے معنے خدا سے غداری، عہد شکنی اور سرکشی کے ہیں۔ بے شک فرعون نے تمام لیڈروں کی طرح ہر قسم کے حربے استعمال کئے لیکن قوم کی اطاعت کرنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ قوم خود بھی اللہ کی غدار اور عہد شکن تھی۔ اس طرح قرآن نے لیڈروں اور قوم دونوں کو ہی تباہی کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ اس آیت کی تفسیر مفہوم القرآن میں اس طرح درج ہے: ''غرض وہ اس قسم کے پراپیگنڈہ سے اپنی قوم کو فریب میں مبتلا رکھنے کی کوشش کرتا رہا تاکہ وہ سوچ سمجھ سے کام نہ لے سکیں بلکہ اندھا دھند اس کی اطاعت کرتے رہیں لیکن حق بات تو یہ ہے کہ وہ قوم خود ہی غلط راستوں پر چلنا چاہتی تھی۔ (ورنہ اگر قوم صحیح راستے پر چلنا چاہے تو مستبد قوتوں کی طرف سے کسی قسم کا پراپیگنڈہ اسے متاثر نہیں کر سکتا)۔ (مفہوم القرآن، صفحہ 1150)۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

ایک عظیم قرآنی خزانہ

قرآن مجید پر غور و فکر کرنے والوں کے لئے خوشخبری

مفکرِ قرآنِ مجید علامہ پرویزؒ صاحب کی زندگی بھر کی قرآنی بصیرت کو دیکھا اور سنا جا سکتا ہے۔

WWW.TOLUISLAM.COM

سی ڈی اور کتب کی خریداری

☆ بیرون ملک bazmdenmark@gmail.com, PDF.EBOOK

☆ اندرون ملک، فون: +92 42 35753666، ای میل: trust@toluislam.com

ڈاکٹر عطاء الرحمٰن

ایک مختلف جمہوری نظام

آج کے دور میں ترقی وخوشحالی کی کنجی ''تعلیم'' ہے۔ برطانیہ کے سابق وزیراعظم ٹونی بلیئر سے ایک مرتبہ پوچھا گیا کہ آپ کی حکومت کی تین اہم ترین ترجیحات کیا تھیں' انہوں نے برجستہ کہا ''تعلیم' تعلیم اور تعلیم''۔ موجودہ دور میں وہ ممالک جن کے پاس علم ودانش کے وسائل موجود ہیں وہ اپنی جدت طرازی اور بہترین تنظیم نو کے بل بوتے پر ترقی کی راہوں پر گامزن ہیں۔ دراصل وقت کی اہم ضرورت اقتصادیات میں ایک ایسا نظام جو اعلیٰ تعلیم' سائنس وٹیکنالوجی اور جدت طرازی پر مبنی ہو۔ دواسازی کے شعبے سے لے کر انجینئرنگ کا سازوسامان ہو۔ حیاتیاتی طبی آلات سے لے کر لیپ ٹاپ کمپیوٹر ہوں' نازک دفاعی سازوسامان سے لے کر موٹر گاڑیاں اور ہوائی جہاز ہوں' سافٹ ویئر سے لے کر شمسی توانائی کے خلیے ہوں' یہ سب علمی معیشت کے اہم جز ہیں۔ اگر ہم اس سماجی اقتصادی دور میں امتیازی حیثیت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو یہ مقام پانے کے لئے ان چار بنیادی ستونوں پر عملدرآمد کرنا ہوگا۔

1- تعلیم -2- سائنس وٹیکنالوجی 3- جدت طرازی -4- ایماندار سرپرستوں کے زیر سایہ بہترین انتظامی امور ونگہداشت۔

1947ء میں پاکستان سیکڑوں لوگوں کی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے بعد معرض وجود میں آیا تا کہ ہم ظلم وزیادتی سے پاک ایک جداگانہ ریاست میں سانس لے سکیں لیکن 66 سال گزر جانے کے بعد بھی ہم اپنے آپ کو ترقی سے تنزلی کی طرف چلتا دیکھ رہے ہیں۔ ان سب کی وجہ اعلیٰ پیمانے پر کی جانے والی بدعنوانی' سپریم کورٹ کے فیصلوں کی حکم عدولی' حکومتی نظام کا فرسودہ' جاگیردارانہ نظام کے شکنجوں میں ہونا' ناخواندگی کی کثرت جو کہ غربت' افلاس عدم تحمل اور دہشت گردی کو جنم دیتی ہے۔ وفاقی وصوبائی پارلیمنٹ میں کثیر تعداد میں جعلی ڈگریوں کے حامل اراکین پارلیمنٹ موجود ہیں۔ کم ازکم 300 اراکین پارلیمنٹ جعلی ڈگریوں کے حامل ہیں اور سپریم کورٹ کے ابتدائی اعلامیے کے مطابق الیکشن کمیشن کو حکم صادر فرمایا گیا تھا کہ ان جعل سازوں کی شناخت کی جائے اور ان کے خلاف سخت کارروائی بھی کی جائے لیکن اس پر کوئی عملدرآمد نہیں ہوا اور سپریم کورٹ بھی ان افراد کے خلاف کسی بھی قسم کی قانونی چارہ جوئی کرنے سے قاصر نظر آتی ہے۔ جاگیردارانہ نظام اور ناخواندگی ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ایسے بھیانک عناصر ہیں جو ہماری بھوک وافلاس کو مٹانے کی تمنا کو ایک سراب بنا رہے ہیں کیونکہ جاگیرداروں پر مشتمل پارلیمنٹ کبھی بھی تعلیم کو فروغ نہیں دے گی' یہ اُن کے جاگیردارانہ نظام کی بقاء کو شدید دھچکہ ہوگا۔ پاکستان دنیا کا وہ واحد ملک ہے جہاں یہ جاگیردارانہ نظام اپنی اصلی حالت میں آج بھی زندہ ہے۔ پاک وہند کی تقسیم کے بعد جواہر لال نہرو نے بڑی اصلاحات کے ذریعے جاگیردارانہ نظام کو ختم کر دیا تھا اور بنگلہ دیش نے بھی پاکستان سے علیحدہ ہونے کے فوری بعد یہ نظام ختم کر دیا۔ ان کا یہی قدم خالص جمہوری نظام کے قیام کا سبب بنا۔ پاکسان میں جاگیرداروں سے مغلوب پارلیمنٹ نے اس طرح کا کوئی بھی عمل کرنے اور قانون بنانے سے انکار کر دیا جو اُن کے مفادات کے خلاف ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں خالص جمہوری نظام آج تک قائم نہ ہوسکا جس کی وجہ سے ملک میں تعلیم کے شعبے کو شدید

نقصان پہنچا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی سماجی واقتصادی ساکھ بھی نشوونما نہ پاسکی۔ آج پاکستان کا شمار دنیا کے نچلے درجے کے اُن سات ممالک میں ہوتا ہے جو ملک کی مجموعی پیداوار (GDP) کا صرف 1.7% حصہ تعلیم پر خرچ کرتے ہیں۔ علم وہنر کا فقدان بے روزگاری اور بڑھتی ہوئی مایوسی اور عداوت کا سبب بنا۔ تقریباً 90 ملین لوگ انیس سال سے کم عمر ہیں جو ملک کی آبادی کا 56% حصہ ہیں۔ اس کثیر آبادی کی نشوونما کا بڑا موقع ان بااختیار لوگوں کی وجہ سے ضائع ہو رہا ہے۔

جمہوری نظام کے قیام کی ناکامی کا سبب فوج کی مداخلت کو گردانا جاتا ہے اور یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ جمہوریت کو صحیح نہج پر اُبھرنے اور پنپنے کا موقع ہی نہیں دیا جاتا' درحقیقت فوج کو بارہا مداخلت کے لئے مجبور ہونا پڑا تاکہ اس لوٹ مار اور غبن کو روکا جاسکے جو اس جاگیردارانہ جمہوریت کا شیوہ بن گیا ہے۔ ''جاگیرداریت'' وہ لفظ ہے جو میں نے اس ملک میں قائم ہولناک جمہوریت کو دیا ہے۔ آج ہمیں ضرورت ہے نیا رخ اختیار کرنے کی اور ایسا نظام اختیار کرنے کے چند نمایاں نکات یہ ہیں۔

1- پاکستان کو ایک ایسا جمہوری صدارتی نظام قائم کرنا چاہئے جہاں عوام کو ایک ایسا شخص چننے کی مکمل آزادی ہو جو نیک' قابل اور ملک وعوام کی قیادت کے لائق ہو پھر اس شخص کو بہترین ہنرمند وضروری تکنیکی صلاحیتوں کے حامل لوگوں سے وزیروں اور سرکاری سیکریٹریوں کی ایک ٹیم مرتب کرنے کی اجازت ہو۔ 2- سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ سے ریٹائرڈ ججوں پر مشتمل ایک ''اعلیٰ عدالتی کونسل'' قائم کی جائے جو خود مختار ہو اور حکومتی مداخلت کے بغیر کسی بھی قسم کے چناؤ اور ردوبدل کرنے کا اختیار رکھتے ہوں۔ ان حضرات کی کونسل کی ذمہ داری ہوگی کہ نہایت باریکی سے نامزد کئے گئے لوگوں صدر' اراکین پارلیمنٹ' اراکین سینیٹ اور بڑے عوامی اداروں کے سربراہوں کی اچھی طرح جانچ پڑتال کے بعد نامزدگی قبول کریں۔ یہ منظوری بے داغ کردار نمایاں صلاحیتوں کے مالک' عمدہ اور نمایاں کارکردگی کے حامل ہوں۔ 3- پارلیمنٹ کا کردار قانون سازی اور اس کی بجا آوری پر معمور ہو' اس قانون سازی کے لئے اراکین پارلیمنٹ اور سینیٹ کی تعلیمی صلاحیت بھی اس کے مطابق ہو' پارلیمنٹ اور سینیٹ کے اراکین کے چناؤ کے لئے وہ لوگ ہی اہل ہوں جو ان لازمی علمی صلاحیتوں کے مالک ہوں۔ 4- تمام سرکاری ادارے (مثلاً پی آئی اے' پاکستان اسٹیل مل' پاکستان ریلوے' واپڈا' پی ٹی سی ایل وغیرہ) کی اعلیٰ درجہ کونسل۔ (Governing Body) (اعلیٰ عدالتی کونسل کے معائنہ شدہ ومنظور شدہ ہو)۔ ان اداروں کے سربراہان حکومت کی طرف سے ہرگز نہ مقرر کئے جائیں بلکہ انہی اداروں میں اندرونی چناؤ کے ذریعے مقرر کئے جائیں۔ 5- ملکی آئین میں ضروری ردوبدل کے بعد GDP کا کم ازکم 7% حصہ تعلیم کے لئے مختص کرنا لازمی قرار دے دیا جائے۔ 6- بدعنوانی کی روک تھام کے لئے NAB' FIA اور دوسری بدعنوانی کی روک تھام کی ایجنسیوں کے سربراہان اور بڑے عہدے کے لوگوں کو حکومت کے بجائے اعلیٰ عدالتی کونسل کے ذریعے مقرر کیا جائے۔ 7- عدالتی نظام کی بڑے پیمانے پر ترمیم کی جائے اور ہزاروں کی تعداد میں اضافی جج مقرر کئے جائیں تاکہ انصاف کا حصول زیادہ سے زیادہ تین مہینے کی آخری حد کے اندر اندر ہو جائے۔

اب سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کون یہ سب تبدیلیاں لائے گا؟ یقیناً جاگیرداروں سے مغلوب پارلیمنٹ کے لئے تو آئین میں ایسی تبدیلی اور ردوبدل لانا سخت ناگوار ہوگا جو ان کے مفادات کے عین خلاف ہوگا۔ یہ آئین کی تبدیلی جس کے ذریعے

منفرد صدارتی جمہوریت کا قیام ہو سکے صرف جب ممکن ہے کہ ایک عبوری تیکنیکی حکومت عدالت اور فوج کی مہربانی سے قائم کی جائے۔ امید ہے کہ سیاسی پارٹیوں میں ضرور کوئی ایسے روشن خیال لوگ ہوں گے جو عوامی مفاد کے حق میں اس آئینی ترمیم کی حمایت کریں گے۔ باوجود اس کے کہ انہیں اپنے جاگیر دار ساتھیوں کی سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ہمیں زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں کہ کس طرح ایشیائی ممالک کس تیزی سے اقتصادی دیو کا روپ دھارتے جا رہے ہیں لی کوان یو (Lee Kwan Yew) نے جون 1959ء میں سنگاپور کے وزیرِ اعظم کا عہدہ سنبھالا تھا اور تین دہائیوں کے اندر ہی سنگاپور ایک اقتصادی دیو بن گیا۔ اس کی آبادی صرف 5 ملین ہے لیکن اس کی 250 بلین ڈالر GDP ہے جو کہ پاکستان کی 180 بلین آبادی کے GDP سے کہیں زیادہ کم ہے۔ یہی صورتِ حال ملائیشیا میں دیکھنے میں آئی۔ مہاتیر محمد کی روشن خیال اور دور اندیش پالیسیوں کے ذریعے ملائیشیا آج دنیائے اسلام میں 86.5% برآمدات کرتا ہے اور اس کا GD 26 بلین ڈالر سے بڑھ کر بمطابق 1980ء میں 300 بلین ڈالر ہو گیا۔ جنرل پارک چنگ ہی (Gen. Park, Chung hee) نے کوریا کی اقتصادیات قائم کی وہ غریب مملکت جس کی فی کس آمدنی 1961ء میں صرف 72 / امریکی ڈالر تھی آج انتہائی درجہ بڑھ کر فی کس آمدنی 30200 ڈالر ہو گئی ہے اور GDP 1.2 ٹریلین ڈالر سے بھی زیادہ ہو گیا ہے۔

ہم بھی ایسا کر سکتے ہیں ضرورت ہے نیک روشن خیال اور دور اندیش لیڈروں کی۔ سپریم کورٹ اور فوج کو ان تجاویز پر یکجا ہونا چاہیے تاکہ پاکستان بھی اس راکھ سے ابھر کر ایسی نئی صدارتی جمہوریت قائم کر سکے جس کا ابھی اوپر ذکر کیا گیا' اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے۔ (بشکریہ جنگ)

سانحہ اِرتحال

محترم غلام باری صاحب کی رفیقۂ حیات گذشتہ دِنوں طویل علالت کے بعد مانچسٹر یو۔کے میں وفات پا گئی ہیں۔ مرحومہ نہایت نیک سیرت اور پاکیزہ مزاج کی حامل تھیں۔

ایک طویل رفاقت کے بعد رفیقۂ حیات کے بچھڑ جانے پر ادارہ طلوعِ اسلام محترم غلام باری صاحب اور اُن کے بچوں کے دُکھ میں برابر کا شریک ہے۔

دُعا ہے کہ اللہ مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنت عطا فرمائے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل سے نوازے۔

(ادارہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آپ کے خطوط

محترم جناب ایڈیٹر صاحب ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

السلام علیکم: عرض ہے کہ 20 جولائی 2012ء کے روزنامہ آواز لاہور میں 'ایڈیٹر کے نام خط' کے تحت مندرجہ ذیل خط شائع ہوا ہے:

لاہور میں بھکاریوں کے ڈیرے

''مکرمی! آپ کے اخبار کی وساطت سے ڈی سی او لاہور کی توجہ درج ذیل مسئلے کی طرف دلانا چاہتے ہیں عید کی آمد آمد ہے اور ابھی سے بھکاریوں نے لاہور کے ہر علاقے میں ڈیرے ڈال دیئے ہیں، کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں بھکاریوں نے شہریوں خصوصاً خواتین اور بینکوں سے نکلنے والے لوگوں کی ناک میں دم نہ کر رکھا ہو کسی بازار میں چلے جائیں اور خصوصاً سڑکوں پر اشارے کے قریب یہ بھکاری آ جھپٹتے ہیں جیسے چیلیں یا کوے گوشت پر آتے ہیں ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے کیونکہ ان میں سے اکثر جیب تراش اور چور بھی ہوتے ہیں۔

نجیب اشرف سنت نگر لاہور''

اس سلسلے میں آیتِ مبارکہ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۡ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ [2:273]

سر سیّد احمد خانؒ کا ترجمہ یہ ہے:

خیرات ان فقیروں کے لئے ہے جو روکی ہوتے ہیں (یعنی سوال کرنے سے) اللہ کی راہ میں، نہیں استطاعت رکھتے چلنے کی زمین میں (یعنی سفر کرنے کی) گمان کرتا ہے نادان ان کو دولت مند سوال سے باز رہنے کے سبب سے، تو ان کو پہچانتا ہے ان کے چہرہ سے۔ نہیں سوال کرتے لوگوں سے لپٹ کر، اور جو کچھ تم کرو گے خیرات سے تو بے شک اللہ اس کا جاننے والا ہے۔ (تفسیر القرآن)

غلام احمد پرویزؒ نے مفہوم القرآن' میں اس آیت کا یہ مفہوم لکھا ہے:

یہ بھی یاد رکھو کہ اس روپیہ کو پیشہ ور بھک منگوں پر خرچ نہیں کیا جائے گا۔ یہ ان حقیقی ضرورت مندوں کے لئے ہوگا جو اس نظام کی تشکیل کے سلسلے میں کہیں روک دیئے گئے ہوں۔ وہ نہ وہاں سے کسی اور جگہ جا سکیں اور نہ ہی وہاں رہتے ہوئے اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ ان میں (سیرت کی پختگی کی وجہ سے استغناء کا یہ عالم ہو کہ) ناواقف یہی سمجھے کہ ان کے پاس بہت کچھ ہے انہیں کسی چیز کی کمی

نہیں۔ البتہ جاننے والے انہیں، ان کے چہروں پر نمودار ہو جانے والے اثرات سے پہچان لیں یہ لوگ لپٹ لپٹ کر مانگنے والے گداگر نہیں ہوتے ان لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے تم جو کچھ دو گے اللہ کو اس کا پورا پورا علم ہو گا۔ یعنی اُسے دینے والوں کی نیت کا بھی علم ہوتا ہے اور لینے والوں کی ضروریات کا بھی۔

اس آیت کا 'القرآن الکریم' میں مولانا محمد جونا گڑھیؒ کا یہ ترجمہ دیا گیا ہے:

صدقات کے مستحق صرف وہ غربا ہیں جو اللہ کی راہ میں روک دیئے گئے۔ جو ملک میں چل پھر نہیں سکتے۔ (1) نادان لوگ ان کی بے سوالی کی وجہ سے انہیں مالدار خیال کرتے ہیں۔ آپ ان کے چہرے دیکھ کر قیافہ سے انہیں پہچان لیں گے۔ وہ لوگوں سے چمٹ کر سوال نہیں کرتے۔ (2) تم جو کچھ مال خرچ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کا جاننے والا ہے۔

اور مولانا صلاح الدین صاحب نے اس آیت کے تفسیری حواشی یہ رقم کئے ہیں:

(2) اس سے مراد وہ مہاجرین ہیں جو مکہ سے مدینہ آئے اور اللہ کے راستے میں ہر چیز سے کٹ گئے۔ دینی علوم حاصل کرنے والے طلبا اور علماء اس کی ذیل میں آ سکتے ہیں۔

(3) گویا اہل ایمان کی یہ صفت ہے کہ فقر و غربت کے باوجود وہ تعَفُّفْ (سوال سے بچنا اختیار کرتے ہیں۔ اور الحاف (چمٹ کر سوال کرنا) سے گریز کرتے ہیں۔ بعض نے الحاف کے معنی کئے ہیں، بالکل سوال نہ کرنا کیونکہ ان کی پہلی صفت عفت بیان کی گئی ہے (فتح القدیر) اور بعض نے کہا ہے کہ وہ سوال میں الحاح وزاری نہیں کرتے اور جس چیز کی انہیں ضرورت نہیں ہے اسے لوگوں سے طلب نہیں کرتے اس لئے کہ الحاف یہ ہے کہ ضرورت نہ ہونے کے باوجود (بطور پیشہ) لوگوں سے مانگے۔ اس مفہوم کی تائید اُن احادیث سے ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ''مسکین وہ نہیں ہے جو ایک ایک دو دو کھجور یا ایک ایک دو دو لُقمے کے لئے دَر دَر پر جا کر سوال کرتا ہے۔ مسکین تو وہ ہے جو سوال سے بچتا ہے''۔ پھر نبیؐ نے آیت (لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافاً) کا حوالہ پیش فرمایا (صحیح بخاری، التفسیر والزکاۃ) اس لئے پیشہ ور گداگروں کی بجائے سفید پوش ضرورت مندوں کا پتہ چلا کر ان کی امداد کرنا چاہئے جو سوال کرنے سے گریز کرتے ہیں، کیونکہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا انسان کی عزت نفس اور خودداری کے خلاف ہے۔

مندرجہ بالا تراجم و تشریحات سے واضح ہے کہ اہل ثروت پیشہ ور گداگروں کو کما کر کھانے کی ترغیب دیں اور سوال نہ کرنے والے باغیرت مستحقین کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کی مدد کریں اور ان کو خود کفیل بنانے کی پوری کوشش کریں۔ براہ مہربانی عریضہ ہذا کو اپنے موقر جریدے کی قریبی اشاعت میں شامل فرما کر شکر گزار فرمائیں۔

آپ کا خیر اندیش: محمد اکرم راٹھور

بزم طلوع اسلام لاہور

بچوں کا صفحہ

عارف محمود کسانہ　سویڈن

مومن کسے کہتے ہیں

امی جان نانا ابو کہاں ہیں مجھے اُن سے ضروری کام ہے۔ شمائل نے اپنی امی سے پوچھا۔ بیٹا وہ اپنے کمرے میں ہوں گے۔ کیوں تمہیں کیا کام ہے؟ امی نے شمائل سے پوچھا۔ یہ تو میں انہیں ہی بتاؤں گا اور یہ کہہ کر شمائل نانا ابو کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ انوشہ اور یاور بھی اُس کے پیچھے پیچھے نانا جان کے کمرے کی طرف گئے۔ شمائل نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے نانا ابو کو سلام کیا۔ انہوں نے بڑے پیار سے جواب دیا۔ اتنی دیر میں انوشہ اور یاور بھی آ گئے اور انہوں نے بھی نانا ابو کو سلام کیا۔ نانا جان نے انہیں بھی پیار کیا اور بیٹھنے کو کہا۔ شمائل کہنے لگا نانا جان میرے سکول میں تقریری مقابلہ ہو رہا ہے جس کا عنوان ہے مومن کی زندگی۔ مجھے آپ سے اس سلسلہ میں مدد لینی ہے۔ آپ مجھے تفصیل سے بتائیں کہ مومن کسے کہتے ہیں اور مومن کی زندگی کس طرح کی ہوتی ہے تاکہ میں اچھی سی تقریر تیار کرسکوں۔

اچھا تو یہ بات ہے' نانا جان نے کہا۔ بیٹا مومن عربی زبان کا لفظ ہے اور یہ لفظ امن سے نکلا ہے جس کا مطلب اطمینان، خوف نہ ہونا، تصدیق کرنا اور بھروسہ کرنا ہوتا ہے لہٰذا مومن کا مطلب ہوتا ہے وہ جو دِل کی سچائی کے ساتھ ایمان کو قبول کرلے، دینِ اسلام کے مطابق چلے اور جس پر بھروسہ کیا جاسکے اور دوسروں کے لیے امن اور سلامتی کا باعث ہو۔ مومن، ایمان، مسلم جیسے الفاظ آپ نے سُنے ہوں گے اِن کا مفہوم ایک جیسا ہی ہے۔ اِسی طرح مسلمان اور مومن ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ جب کوئی اسلام کو دین کی حیثیت سے قبول کرتا ہے تو وہ مسلمان کہلاتا ہے اور جب وہ اپنی زندگی اُس کے مطابق گذارتا ہے تو وہ مومن کہلاتا ہے۔ یعنی جو خدا کو ایک مانتا ہے وہ مسلمان ہوتا ہے اور جو خدا کی ہر بات مانتا ہے وہ مومن ہوتا ہے۔

نانا جان قرآنِ مجید میں مومن کے بارے میں کیا کہا گیا ہے۔ انوشہ نے پوچھا۔

بیٹا قرآن پاک میں بہت سے مقامات پر اللہ تعالیٰ نے مومن کی خوبیوں کے بارے میں بتایا ہے۔ سب سے پہلے یہ کہا ہے کہ مومن وہ ہوتے ہیں جو غائب پر ایمان لاتے ہیں یعنی جو چیزیں اُن کے سامنے نہیں ہوتیں یا جنہیں وہ نہیں دیکھ سکتے مگر اُن کا ذکر قرآن میں موجود ہے اُن پر ایمان لاتے ہیں جیسے مرنے کے بعد کی زندگی۔ اِسی طرح مومن عقل اور فکر سے کام لیتے ہیں، اِس کائنات پر غور و فکر کرتے ہیں، علم حاصل کرتے ہیں۔ انصاف سے کام لیتے ہیں، جھوٹ نہیں بولتے اور سچی بات کرتے ہیں۔ ماپ تول پورا کرتے

ہیں، ضرورت مندوں کو اپنی چیزیں دے دیتے ہیں، فضول باتیں نہیں کرتے، نہ تو تکبر کرتے ہیں اور نہ ہی کسی دوسرے کی بُرائی کرتے ہیں۔ نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ کنجوسی کرتے ہیں۔ اسی طرح مومن دوسروں کے بُرے نام نہیں رکھتے، نہ کسی پر جھوٹا الزام لگاتے ہیں اور نہ ہی کسی کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ آپس میں بھائی بھائی بن کر رہتے ہیں۔ جاہل لوگوں سے بحث نہیں کرتے، اگر کوئی امانت دے تو اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ نرم دل ہوتے ہیں لیکن اللہ کے دشمنوں کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں۔

نانا جان کیا مومن غلط کام بالکل نہیں کرتے۔ کیا اُن سے کوئی گناہ کا کام نہیں ہوسکتا۔ اب یاور نے سوال کیا۔

مومن سے غلطی ہوسکتی ہے مگر وہ فوراً توبہ کرتے ہیں اور غلط کام کو چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ بڑے گناہوں سے بچتے ہیں۔ وہ زمین پر اکڑ کر نہیں چلتے اور نہ ہی چلّا کر بولتے ہیں۔ وہ لوگوں سے تُرش روئی سے پیش نہیں آتے، حسد نہیں کرتے، اپنی تعریفیں نہیں کرتے رہتے، اچھے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ ہمیشہ صاف سیدھی اور دوٹوک بات کرتے ہیں۔ افواہیں نہیں پھیلاتے اور کوئی غلط بات اُن تک پہنچے تو اُسے آگے نہیں پھیلاتے۔ وعدہ پورا کرتے ہیں اور سچی گواہی دیتے ہیں چاہے اُن کے اپنے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ والدین، رشتہ داروں اور یتیموں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں۔ کسی کے ساتھ احسان کر کے اُسے جتلاتے نہیں بلکہ اُسے احساس بھی نہیں دلاتے۔ خود تنگی میں رہ کر دوسروں کی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ اگر کسی نے اُن سے قرضہ لیا ہو تو واپسی کے لیے تنگ نہیں کرتے اور اگر ممکن ہو تو معاف بھی کر دیتے ہیں۔ پہلے اپنی اصلاح کرتے ہیں پھر دوسروں کو تلقین کرتے ہیں۔ اپنے غصہ پر قابو پاتے ہیں، اپنی نگاہ اور ذہن صاف رکھتے ہیں۔ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا نظام قائم کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ اپنی زندگی بغیر کسی خوف کے قرآن کے مطابق بسر کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر دنیا اور آخرت میں اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔

ہمارے رسول حضرت محمد ﷺ نے بھی مومن کے بارے میں کچھ بتایا ہے؟ شمائل نے پوچھا۔

حضور پاک ﷺ نے بھی مومن کی خوبیاں بیان کی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ وہ شخص مومن نہیں ہوسکتا جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے محفوظ نہ ہوں۔ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ مومن وہ ہے جو چیز اپنے لیے پسند کرے وہی اپنے بھائی کے لیے بھی پسند کرے۔ اِسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم اُس وقت تک مومن نہیں ہوسکتے جب تک حضور ﷺ سے سب سے زیادہ پیار نہ کریں۔ جب ہم اُن سے پیار کریں گے تو قرآن کے مطابق زندگی گذاریں گے کیونکہ آپ ﷺ کی پوری زندگی قرآن کے مطابق ہی تھی۔ بچو! آپ کو میں نے مومن کی خوبیاں اور اُس کی زندگی کے بارے میں بتا دیا ہے امید ہے کہ آپ کو سب سمجھ آ گئی ہوگی اور شمائل اب تم اس بارے میں اچھی سی تقریر بھی تیار کر سکتے ہو۔

جی نانا جان جب آپ بتا رہے تھے میں ساتھ ساتھ لکھتا جا رہا تھا اور اب میں بہت اچھی تقریر تیار کروں گا اور مجھے امید ہے کہ پہلا انعام بھی میرا ہی ہوگا!

Surah Al-Mulk Durus-al-Qur'an Parah 29: Chapter 3

By G. A. Parwez

(Translated by: Dr. Mansoor Alam)

Dear Friends! Today is October 14, 1983 and the Dars-e-Qur'an begins today with verse 6 of chapter 67 of the Qur'an.

The relationship of astrology and kismet is against the Qur'an

In the last dars we could cover just one point and which was that predicting human destiny based on astrology or by using any other method is fundamentally against the teachings of the Qur'an. For example, those who sit on the footpath with a parrot also predict future. These ways of predicting human kismet, in fact, degrade humanity. As I understand the Qur'an has declared this predicting of future an extremely severe and worst kind of crime. I mentioned in the last dars that what makes humans higher than all other creations in the Universe is their freewill and freedom of choice. Therefore, any belief or school of thought that tells otherwise is against the basic teachings of the Qur'an. If a human being loses his freedom of choice then he is not accountable for any of his actions. Obviously, a person is not responsible for his actions if done under compulsion. The focal point of the entire teaching of the Qur'an is that human being's every action even his thought produces its consequence. Good actions produce good results and bad actions produce bad results. This is called the law of requital. But this is possible only if a human being is free and uses his freewill and freedom of choice to act. If one cannot act with one's own freewill and cannot use one's freedom of choice then how can one be held responsible for that action? The entire chain comprising of transmitting Allah's revelation through Prophets, the law of requital, the life in the hereafter, and its heaven and hell circles around this central point that a human being *is* accountable for his actions. And obviously only that person can be held accountable for his actions if and only if he is free to use his freewill and freedom of choice. If you believe that a human being is not free to exercise his freedom of choice, or his future is predetermined; then this entire process of sending guidance and rectitude becomes useless and meaningless. This is the reason the Qur'an has very strongly opposed such a concept. This is not just the case with astrology but it is extremely fundamental. What you say prophecy is only for those objects which do not have freewill and they are the only things about which you can make prophecy.

Difference between having freewill and not having freewill

My dear friends! One can tell today when precisely the lunar eclipse will occur after 100 years and when precisely it will disappear. This is because the movements of the Earth and the moon around the Sun occur according to fixed laws of nature. These laws do not change and the objects subject to these laws do not have the freewill to disobey them. After one acquires the knowledge of these laws and since these laws do not change one can predict such events beyond not just 100 years but also beyond 1000 years. These celestial bodies are subject to the laws of nature and that is why one can predict such events. Contrary to this, if you remember, I told you about a scientist's observation which is extremely interesting. He is the author of the book, *Limitations of Science*. He has written that one scientist alone can tell you when the lunar eclipse will occur after 100 years. But 10 scientists sitting around a table cannot tell where this fly would go next that just came and sat on the table. Why couldn't the ten scientists tell this about the fly whereas one single scientist could tell exactly about the occurrence of lunar eclipse in future? This is because that one scientist is talking about something without freewill whereas these ten scientists are dealing with something that has freewill. Dear friends! This is it! This is the secret of prediction. If no one can say about a fly where it will sit next, then to say about a human being what he will do in future is equivalent to making him without freewill. This is the reason a thing which does not work according to laws and regulations cannot come under the purview of knowledge.

Dear friends! Any prediction based on laws is knowledge. However, such predictions made about those with freewill will not qualify as knowledge. For example, saying that someone will get pneumonia after a year or will become king or will be arrested; all this is being told about a human being with freewill. This is generally called the knowledge of the unseen (*'Ilm-ul-Ghaib*). But Allah has said that no one knows the knowledge of the unseen except Him. Even about the Prophet (PBUH) Allah told that whatever he is telling his people about future events it is given to him through revelation. If Allah did not give this knowledge of the unseen to the Prophet (PBUH) through revelation then even he could not say this about future. Even *he* (PBUH) does not have the knowledge of the unseen. Now, if the situation is this that *even* the Prophet (PBUH) could not have this kind of knowledge of the future, that *even* he could not make prophesies about human beings; then how come we have *these* people among us making predictions on a daily basis; and where the entire edifice of mysticism (Tasawwuf/Vilayat) stands on these predictions so much so that one amongst us claimed prophethood on this basis! And the debate with him raged

around whether a prophet can come now or not. The question actually should have been whether a human being can make prophecies or not. Claim that you have received revelation from Allah and He has told that you have become a prophet! Then the argument can be settled easily. When Allah says that no human being not even the Prophet can make prediction about future (except what Allah gave him through revelation) then, is it not play and con-game on the part of these people who make predictions using astrology, using parrots by the side of the footpath, using palmistry? This is because we have left the Qur'an. If we care to take guidance from it then it will tell that we are a live human being with freewill not subject to stars.

The Qur'an's order

Please remember! What the Qur'an says about any ideology that turns "live dust" into "dead dust"? It says: It is *kufr* (67:6). A human being does kufr against his own self with belief in this kind of ideology because he is denying that he possesses freewill. And anyone who is telling him to do this is lying and also he is claiming Godly power because knowledge of the unseen only belongs to Allah; therefore, he is denying Allah. Both the teacher and the follower of this kind of ideology are Kafirs.

Nations suffering life of hell

The Qur'an says that those who deny their Allah-given power of freewill and freedom of choice are denying their self and those who deny the power of Allah (and seek power elsewhere) are denying the existence of Allah (67:6). Dear friends! The punishment of Hell after death will be known in the Hereafter. But we all know what kind of hellish humiliation and subjugation surround those nations which do not have (or do not consider having) the power of freewill. Even their domestic laws and policies are made by other nations essentially making these other nations their Masters. What can be greater hell than this?! Allah has called the gatekeeper of Hell as Master (43:77). Although subjugated nations keep calling themselves sovereign powers but that is a lie. What an awful hell it is that they live in! This is a strange thing. The Qur'an has repeatedly mentioned Jahannam in connection with punishment for crimes. It says Jaheem for hell in some places and al-Naar in other places. Here it says Jahannam. The description of Jahannam that is given here by the Qur'an in metaphorical terms is of a maximum security prison indicating the severity of the crime. It says that when they will be thrown in it then loud sounds of agony and cry of pain and terror will be heard; that Hell would be furiously erupting with fire (67:8), as

if it is full of rage. From this we can sense the severity of the punishment and the intensity of the crime described by the Qur'an; otherwise, it would be sufficient to say just Jahannam.

As I have mentioned there is no greater crime than abandoning or denying one's freedom of the power of choice. This is the ONLY exclusive gift bestowed to human beings. Allah has called this gift His divine energy. This makes humankind uniquely special in comparison with all the other creations. By denying this Allah-given unique gift one degrades one's humanity. It is to accept humiliation. That is why the punishment is so severe. Now, after this, the Qur'an says that when the soothsayers and astrologers and their followers will be thrown in hell wave after wave then the gatekeeper of hell will ask them: Didn't someone come to warn you of the consequences of such beliefs and ideologies? Didn't someone tell you that this is *shirk* and *kufr*?

Fulfillment of two conditions before destruction

Dear friends! The Qur'an has said repeatedly that no nation is destroyed by Allah's law unless two preconditions are met: 1) that the message must be conveyed to them that their behavior is leading to their destruction. This is called warning. And 2) that they should have the ability to understand that message. What a fair judge is He!? How unique are these conditions! The message must have reached people and that they should have the ability to understand the message. An insane cannot commit crime. One cannot hold him accountable.

From live dust to dead dust

Dear friends! They will be asked: Didn't someone come to tell you what your place in the Universe is that you turned yourself from a live to dead dust? Whether someone came to warn you or not? The Qur'an says they will tell: Yes! Certainly he came to warn us but we did not listen. Friends! Please remember! All the prophets that came before Prophet Muhammad (PBUH) were messengers that warned their people. After them, their true followers performed this duty of warning. But Prophet Muhammad (PBUH) *is* the last prophet. He was told to warn people through the Qur'an (7:2). After him no more prophets are going to come, but the warning is going to continue now through the Qur'an by the Prophet's Ummah.

The obligation of the Prophet's Ummah

When the Qur'an has been preserved forever and the Prophet's Ummah has been made the inheritor of this Book then there is no need of any prophet to come to give this warning and fulfill this duty. Now, it *is* to be done through the Qur'an. The Qur'an is protected and exists in its original unaltered form. And since the Ummah has been made the inheritor of this Book, it is therefore obligatory on this Ummah to fulfill this duty. But when this Ummah itself is guilty of the crime (of not fulfilling its duty) then *how* can it warn others? In any case, this was the question the guard (*Maalik* of Hell) will ask these people being driven to Hell: whether or not a Warner came to you? This does not mean that he is asking if a prophet came or not? It means that since Allah's Book was there, then, was there no one who fulfilled this duty and conveyed its message to you? Please notice how important is this duty that has been placed on this Ummah! But Alas! The Ummah is guilty of the crime of neglecting this fundamental duty.

Dear friends! The Qur'an points out as to why we are suffering this humiliating punishment by delineating our each and every crime. The biggest punishment is that the name of the guard of Hell is '*Maalik*.' Obedience of humans by humans is the biggest hell. Now, the conversation had been continuing about whether or not warner came. In response to the question from Maalik, they said: Yes! He came. Then Maalik asked: What did you do? They replied: We belied him. We said you are lying that we will suffer punishment; that we will be destroyed; that we will suffer humiliation. We told him repeatedly that you are lying, that you are not receiving any revelation from Allah. We condemned those who followed the warner. We told them you are being misled by him. On the contrary, we claimed that *we* are on the right path. Now the Qur'an says that they admitted to Maalik that if we only had listened to the warner and used our intellect then we would not be in this abyss, in this hell. Alas! (67:10).

Not using intellect and thought leads to hell

Dear friends! The verse (67:10) brings out a unique point in the above verse: What was the thing that fortune tellers were using to predict future, and these people were blindly following them? It was a claim based on the knowledge of the unseen. Neither the people, nor the ones whom they approached, used knowledge and intellect in this. Actually, there is no place of 'why' in this. My dear friends, please listen! Those who are being driven to their hell, what are they saying? They are saying that if we had listened to the warner and used our intellect then we won't be in

hell. Now the Qur'an has explained who are the people destined for hell. The Qur'an has elaborated and explained this in many places. It places great importance on using intellect, deep thinking, and intense deliberation. Here, the Qur'an summarizes in their own words of why they are in hell: They said we were listening to astrologers, soothsayers, fortune tellers, palmists, and we were not using our own intellectual power; that is the reason why we are now in hell. I will present another verse (7:179) to explain this further. But first, our traditional translation of this verse which puts us on the wrong path. Traditionalists start the translation like this: “Allah has said that I have created majority of the Jinn and humans for hell…” Think about it. If Allah has created them for hell then how can they go to heaven? Do you imagine where these translations are taking us? Then there is mention of Jinns in these translations which send the Jinns to hell as well. As I mentioned many times before the Qur'an has this unique and distinct quality that it preserves within its pages the Arabic language and its phraseology of the time of the Prophet (PBUH), and to understand the true meaning of words and phrases we have to see how they were used at that time. For example, take these words 'Ins' and 'Jinn'. The population in the deserts of Arabia was composed of two groups of people: Nomads, who used to move around and lived in places far away from towns; and those who used to live in towns. Even now, there are few large towns in Arabia and most of the population lives a nomadic life and mostly invisible to the town's people. Anything that is hidden from the eye is called 'Jinn' in Arabic language and those people who live in towns and cities as a social group are called 'Ins'. So, nomads were called 'Jinns' and the city people were called 'Ins'.

Those deprived of intellect and thought

The Qur'an (7:179) says that those who do not use their Allah-given intellect to understand its message, it is clear from their demeanor that they are destined for hell. Who are these people? They have the ability to understand but they do not use it. Dear friends! Do you see what the Qur'an is talking about of the people of hell? It is talking about choice. If it was the case that they did not have the ability to think then it would not be a matter of choice. They would, in that case, be helpless. But the Qur'an starts with '*Lahum qulubun*”, i.e., they have mind but they do not use it to think. This is the first thing. Qur'an then goes on: They have 'eyes' but they do not use them to 'see'. Then it says: they have 'ears' but they do not use it to 'hear'. They remain dumb, blind, and deaf. They do not use their intellectual and mental powers to think and to understand. Now, it is obvious who the people are who are preparing themselves for hell. These are the people about whom the Qur'an says “Wa laqad zara'na li-

Jahannam" (7:179). These are the people who are subject to Our this law: "Not using mind and power of critical thinking leads to hell". These people are not using the faculty of intellect that was given to them. They are preparing themselves for hell. The Qur'an says that when you find such people, know that they are companions of hell; that they have now been identified in this very world as companions of hell as the verse (7:179) exemplifies. On the other hand, our current man-made Shariah forbids critical thinking and using intellect in matters of Din. Now it should be clear why the Qur'an says that those who do not use their faculty of intellect their very demeanor tells that they are companions of hell. But the Qur'an goes further. It tells that these people are not humans but animals. No! Actually, they are worse than animals (7:179).

Worse than a fly

My dear friends! Verse (7:179) says that they are worse than animals. That is, they are worse than even a fly which at least uses its freedom to fly and sit anywhere it likes. But these human animals do not use their intellect. An animal sitting in sun goes to a shade whenever it wants. But it is this human animal that says my fate is predetermined so why challenge it. Qur'an says: such people are unmindful, and are among the "*Ghafiloon*". What a word "*Ghafiloon*" is? It means that they possess everything required for critical thinking but remain unmindful. They do not use them. But when in hell, they will say: if only we could have listened to the warnings of the messenger, then why would we be in hell today?!

Listening to the Qur'an without meaning, and reading it without understanding

My dear friends! There is only one way of avoiding hell. The standard for this has been set by the Qur'an: whatever Allah says in the Qur'an, it must be listened to carefully and understood using intellect and thought, and then it must be translated into action. But it has become customary for us to listen to the Qur'an without understanding. No other book is listened to as much as the Qur'an. But this listening is such that there is no place in it for intellect and thought. We have become accustomed to listening words without understanding their meaning: neither the one who recites knows the meaning, nor those who listen understand anything. So, do we think we can proclaim this as *listening* to the Qur'an? When those who are going to hell say, that if only we had listened with the intention to using our minds to understand the message then we would not be in this position, then it means that

whatever words we hear we should try to find out their meaning. If we do not know the meaning of words then what is the meaning of pondering on those words? That is why the Qur'an in the verse (7:179) says that these people are not human beings but animals. It is as if one recites to animals or to humans, it does not matter. That is the reason why the verse (67:11) says that they will acknowledge their sin. This is also a unique principle of the Qur'an sinners/criminals acknowledging their sins/crimes. As I have said the Qur'an mentions such principles in a way that one can formulate a state constitution as well as code of laws for the society.

Two principles of code of justice

We can now see from just these two verses (67:10-11) what kind of code of law could be formulated and what should be the basis of the rule of law? First, according to these verses, it is now determined that whoever is being punished, or to be punished, or to be charged must be asked first whether or not the law had reached you beforehand. Note that how important this is in the eyes of the Qur'an. Second, that person must be capable of understanding the law, or if not, then someone must have explained that to him. Note also what the security guard of Hell asked those destined for it. He asked them whether or not messengers had come to warn them about the consequences of their actions. So, it is clear that a state should make an arrangement that the laws it wants to enact should first reach all citizens and they should be able to understand what the laws mean. Also, everyone who is charged must be given chance to explain and say whatever one wants to say in one's defense. This is why the verses say that those people had not entered hell yet. They were still outside hell. And the security guard was asking them whether or not a messenger came to warn them. They were given a chance. If a messenger did not come to them then they could simply walk away by saying that, no, Sir! Messenger did not come to warn us. They would not be charged for the crime they had committed in that case. They would not be sent to hell. Therefore, according to the Quran, every suspect must be given a chance to defend himself and say whatever he wants to say in his defense.

Methodology for lawmaking as derived from the Qur'an

Allah gave even Iblis a chance to explain himself when he refused to prostrate before Adam. He let Iblis say whatever he wanted to say in his defense. Only after this he could be punished if found guilty. As I mentioned before, it is not necessary that guidance in the Qur'an are to be found in the form of law only. Actually, the guiding

principles given in the Qur'an could easily be used to formulate laws. This deductive methodology can be used to formulate laws for an Islamic society. If, even a criminal as guilty as Iblis, has been given chance by the Almighty Allah to explain himself, then *who* is anybody else who can order punishment for someone without giving that person full opportunity to explain and defend himself. Allah, who has supreme authority and absolute power and who has knowledge of everything, if He is giving this right for explanation and self-defense, then no one has the authority to take that right away. These are mentioned in the Qur'an to serve as guidance for us so that we can formulate state constitution and laws for its governance. The whole narrative has been presented in such a way that the people who had committed crime could willingly acknowledge their crime (67:11); that they know full well that witnesses won't lie and the judge will not be wrongly influenced by anything. Then only this would be called 'Adl (justice) in the eyes of the Qur'an.

Precondition for justice: The law itself must be based on justice

The Qur'an has called this 'Adl. One can call it the rule-of-law based justice. This is the same thing which is now called justice since decisions are based on prevailing laws of the time. This is the norm throughout the world. But the Qur'an whose teaching is unique says that if the law itself is based on injustice then how could the judgments based on that law be called justice? Therefore, it is absolutely necessary that the law itself must be based on justice. That is why the Qur'an calls it *"wa bihi y'a-diloon"* (7:181). The right government is one which delivers justice according to this truth, i.e., according to the principles and guidance given in the Qur'an. Then only it will be called true justice. When it is known with complete confidence that the witnesses will provide 100% true testimony and the judge will be completely honest and not subject any influence or bias; that nothing whatsoever will influence the justice system; that the guilty cannot get away by giving any type of compensation; that no one else can take the place of the guilty or provide any material support to him then *this* is the type of justice system that the Qur'an is talking about. Also, one must have full faith in the system for one's defense, and the penalty must be commensurate with the crime and be just. The guilty party must fully understand that true justice has been served, and freely say so. After this the Qur'an says that these are the companions of *'Sa-'eer'* for whom there is so much misery and hopelessness. Whatever are life's miseries these are now their fate. They are far removed from life's good things. Their punishment being that they will be deprived of life's all pleasures and abundance. This in reality is the punishment. As opposed to them there is another

group for whom the Qur'an says that they always fear from the unseen future negative consequences of violating Allah's laws or transgressing His guidance. They know that if they did that the result will be severe punishment.

What is Bil-Ghaib?

What is 'bil-ghaib'? Some people believe by this that anything can happen in future, even mustard can grow on one's palm! Or, it is as if someone moved a stick in a certain way and fire came out. In contrast to this, there is this laborious process a farmer goes through. He works very hard in preparing the ground for planting; selects appropriate and healthy seeds and plants them in the field; waters them; removes the weeds; comes daily to monitor the security of his farm and goes home empty handed every day. He follows the same routine not one day, not one week, not one month, but relentlessly for several months. And the result of his hard work does not come to him. Why does he then do this every day? What is it that drives him to return everyday empty handed and yet compels him to go in the morning the next day? What is it that encourages him to go through this routine every day? This is nothing but the faith and one hundred percent conviction that from those seeds buried in the ground will result a crop that will yield a bumper harvest. This is what is meant by Iman Bil-Ghaib that even though the result does not appear immediately but, nevertheless, having the conviction that it *will* come out at the appropriate time. On what basis is this unseen faith founded? It is founded in the belief that the seed does not have freedom of choice; that it is not up to it to germinate or not to germinate. It follows certain law. It is not up to its own whims whether to grow or not. It is bound by a law. If the soil is right, the seeds are good, fertilizer is there, watering is done at appropriate times, and the farm is monitored and protected, then the crop *will* grow these are all required laws of farming. The seed is subject to these laws. Now it is not up to the seed to violate these laws. This one grain of seed produces hundreds of grains in the words of the Qur'an. This, then, the belief in the unseen results of one's action is what is called *Iman bil-ghaib*.

Qur'anic meaning of Sabr

Dear Friends! In the very beginning the Qur'an has said “Yu minuna bil-ghaib”: They believe in the unseen (2:3). This belief in the unseen is for every effort. Obviously, the result of an effort does not appear right away. It takes time. One has to toil and struggle persistently. The result does appear but after some time. But those nations

who have faith in the efficacy of this law of requital continue to work hard and continue to believe that the results *will* appear in due course. They do not get tired. They neither get frustrated nor get disappointed and resign in the middle of their effort. This is what the Qur'an has called 'sabr' or patience. Sabr does not mean what is prevalent amongst us that when nothing works; when frustration sets in; when people get disappointed, and when they say that nothing can happen: So, dear brothers and sisters! Do Sabr. What can be done?! What was in the kimet will happen anyway! Nothing can be done now!! This is what Sabr has become now-a-days in our culture. But in the Qur'an Sabr is something what a farmer goes through day in and day out for months at time with perseverance and steadfastness. This whole process is what is defined as Sabr according to the Qur'an and the one who perseveres through this process is called Saabir. Qur'an said that this Iman-bil-ghaib requires Sabr. Remember! You must have full faith and conviction in this whole process of Sabr. When the Qur'an says: *Innahu laa yuflihuz zaalimun* (6:21) It means oppressors and tyrants won't flourish; that they will eventually fail. This is the law of requital that the Qur'an proclaims. And this law is unchangeable (6:34). Tyrants and oppressors must remember that this law is bound to produce its consequence, no matter what. But how it will happen? It will happen according to this Qur'anic law of requital that what you sow is what you reap; that tyrants will fail; and that if others join hands with tyrants then the speed of failure will increase. And it must be borne in mind with 100% surety that oppression is bound to fail ultimately. In any case, this is what a farmer's belief in unseen results of his actions is that keeps him going and he knows that each seed when nourished properly is going to produce a hundred grains.

No action produces quick result

Dear friends! Whatever laws the Qur'an has given regarding humans they also have this characteristic that they do not produce results the same day. Now, the complaints we keep hearing daily are: Mr.! We are told that Allah is just; He does justice; He won't let tyrants succeed. But we observe daily that tyrants flourish; that dishonest keep on piling wealth after wealth; that no business succeeds if done honestly. Then what is this?! Why the laws of Allah are not working? Actually, they *are* working but we do not have faith in them. We are not like the farmer who works hard and perseveres months after months, follows the laws of farming; then only he gets the fruit of his labor. We, on the other hand, sit at home and say: Since Allah's law is that from one seed will grow hundred seeds then the day when hundred seeds grow we will go and get them. This is not *Iman-bil-ghaib*. According to the Qur'an *Iman-bil-*

ghaib is: that every worker, every laborer, every technician who has the conviction that whatever I am doing, the machine I am making, the clock I am repairing, maybe it may take six months or a year but one day it *will* work. That one day the result of the effort will bear fruit for which the worker is persevering day and night even while suffering hardships and hunger. This is the steadfast belief in the mission's objective followed by continuous action *and* 100% conviction in the unchangeable law of Allah of requital of the Qur'an that the result is bound to come out for sure at the proper time. We have belied this belief. The truth is that people do not have faith in the law of requital. People say: No Sir! Allah's law of requital does not work. We see that dishonest succeed. The dishonest businessmen flourish. This is belying the law of Allah. When this situation develops then how would people be motivated to work honestly! Having the full faith and conviction in unseen results this is Iman bil-ghaib. And then it says that "Innal Lazeena yukhshawna Rabbahum" (67:12), which is normally translated as "those who are afraid of their Lord". What is this "fear" and what is meant by being "afraid of"? This requires some thought.

Fear and trepidation since childhood

Leave aside the fear and trepidation as developed in today's psychology. The Qur'an says that a nation raised on the basis of its laws as well as its followers will have no fear nor suffer from any anxiety. We, on the hand, right from childhood, sow fear of Allah in the hearts of children. To children then Allah becomes a symbol of fear and trepidation. Fear! Fear! And more fear!! In fact, humanity gets crushed with fear. Yakhshauna, Khashiya: there is nothing in this to fear Allah. Whenever, the Qur'an uses for example, "hum min khashiyati rabbehim" (23:57) then it means: be careful from the adverse consequences of violating the law of requital, being afraid of the consequences that are bound to occur if one does not follow the message of Allah, that when one violates His laws then one will suffer their destructive consequences. This is what is meant by fear. This is a fear of the unseen destructive results of bad actions which do not appear right away.

Period of respite is Allah's mercy

The Qur'an mentions that those who opposed the Prophet (PBUH) used to tell him: Why don't you bring the destruction that you keep on warning us about all the time?! On this, Allah told that they do not recognize His mercy; that they do not realize that He does not punish people right away after they commit wrong; that there is a period

of respite between the wrong action and its consequence. This respite has been bestowed by Him so that people might realize their mistake and correct themselves and thus be saved from destruction. The Qur'an says that if you correct yourselves then it is only good for you. Why should I punish people, says Allah? We do not derive pleasure by punishing people for their wrong actions. The period of respite is also an essential part of the law of requital and, indeed, is a mercy from Allah. Because, if we eat unhealthy food and if we get a disease (e.g. cancer) right away then no one will be saved. In this period of respite, small symptoms appear as warning signs. If we pay careful attention to these symptoms and are able to see a connection between continuing unhealthy food habit and the symptoms then, due to this period of respite embedded in the process there is hope; there is possibility for treatment and cure. If, on the other hand, there is immediate punishment for wrong action then no human being in the world will be saved.

Meaning of Maghfirah

Dear friends! Who is there who does not err, who doesn't indulge? But Allah has kept the door open for treatment and reform. Allah has given power of intellect and thought. He has given freedom of choice too. This is the thing for which He says that they fear the unseen consequences of bad actions *"bil-gahaib"* in Arabic. For them is protection i.e., "lahum maghfiratun wa ajrun kabir" (67:12). This matter has great significance. But we normally translate "maghfirah" as bakhshish, or beggary. And suddenly begging in the name of Allah becomes common theme to the extent that nothing works without begging. Now, even the heaven comes as a result of begging in the way of Allah. Keep on praying for bakhshish and Allah will give Heaven as a bakhshish. Go spread your canvas! And keep begging. But now people drop stale bread in the beggar's pot! No friends! This is not maghfirah; this is not the meaning of maghfirah. Maghfirah means protection. The Qur'an says here that those who fear the consequences of bad actions they get protection. The bad results do not appear right away. There is period for reform and correction.

What a wonderful word Maghfirah is! This is what we call preventive measures. In medical terminology these are those things that provide protection so that no harm occurs. This is called Maghfirah. These preventive measures are great things or "Ajrun Kabir (67:12)" in the words of the Qur'an. If humans did these things then the results that would follow will be of very high level indeed. But the question is: how these high level things will happen? The Qur'an says: "Wa asirru qaulukum awijharu bihi" (67:13). That is, you cannot achieve these things by saying that you respect

these laws but in your heart you are hatching plans against them. You cannot deceive Allah like this. Whether you show your intentions or hide them, to Allah they are the same. The Qur'an talks about freewill and freedom of choice and responsibility. It does not say that the results that appear outwardly, only they will affect you. It even goes so far as to say that every intention in your heart and every thought going through your mind produce result as well. In fact, if one pays careful attention, one can see that it *is* the bad intention that *is* the seed of every crime the external result is the final outcome but its start happens at the time the intention takes root in the heart.

First the intention, then the action, and then the result

Dear friends!
The process starts from *intention*. Human beings first intend to do something and then they embark on practical steps. The Qur'an's law of requital is that it even works on the intention. Now, if someone is caught having bad intention, and he is stopped right there then the crime won't take place. Then the question really becomes: how to have control over intention? This control occurs with proper education and training. With proper education and training if a conviction takes root in the heart that a thing is wrong or criminal, that I should not do it, that I will be held accountable for it, that I will get punished. If these things become the voice of inner conscience of human beings then crime will stop. This is the reason the Qur'an provided these teachings.

External controls do not produce the desired results

Dear friends! The duty of the Prophet was also to teach the Qur'an's message and its wisdom to the people (62:2): "yu'allihumul kitaba wal hikmah". He taught the laws of the Qur'an and explained their wisdom to his people. He explained why these laws are necessary. He had raised a nation based on these teachings. This is always the first step in reforming a society. According to the Qur'an these teachings should become the voice of the heart. What is wrong and what is right should come from the heart. External controls won't work. No matter how much external controls are applied no meaningful long-lasting reform will happen. The Qur'an said that you must understand that actions as well as intentions of the heart both produce results. Human beings must understand that Allah is aware of the thoughts inside their hearts (67:13); that is, they cannot hide anything from Him.

Scope and characteristics of societal justice

Dear friends! The Qur'an says that Allah is a kind of judge that He is aware of even what is going on in your hearts. As for societal justice, it is there in our society. In this kind of justice, when a crime happens and when there are witnesses for it, then only it is called a crime. But this system cannot have grip over the intentions of the heart. The justice system of Allah is not dependent on outside witnesses and it does not require appointment of outside judges. This system has an eye on the thoughts that are still in the form of intentions in the heart. The social reform in Allah's system starts from intentions, from desires, from wishes taking place inside the heart. Once they change then the outside world changes. This is the reason Allah says that He is aware of the passing thoughts in the hearts of human beings. Listen to the evidence! Doesn't He, who created you, not know what is going on inside you? What an evidence this is?! If someone designs and makes a machine, won't he know what is going on within it; that if something is wrong with it then won't he be able to know why? Wouldn't a clock designer be able to know why a clock is not working properly? What an evidence the Holy Qur'an provides! The Creator who created human being won't He be able to know what is going on in the heart? Except Him who else could know what is going on? One who did not create human being? And He is *"Wa huwal latiful khabir"* (67:14). How can one translate this verse?! One cannot really translate Qur'anic words. Now by this word "Latif" we normally mean "delicate" but there is another English word "subtle" which better captures its meaning. This is something that is not obvious but one can feel it. One has to have a different "eye" for it. This can be illustrated by a verse:

How could I tell him what the "blood" of intense desire is?

He is insisting to see its "color" and to know what its "smell" is!

There is no color or smell of the "blood" of intense desire. But only those who have mind's eye can recognize it. Something to recognize this is what is called in Arabic 'Latif". This shows how great the Qur'an is! How deep are its concepts!!

Dear friends! The Qur'an has said that criminals will be recognized from their foreheads (55:41). A momin acquires this visionary power from the Qur'an. There is this beautiful hadith of the Prophet (PBUH): "Be afraid of a momin's visionary power because he sees through the light of Allah". And the light of Allah is none other than the Qur'an. Through the Qur'an a momin acquires this power. Now within the human limitation a person could acquire this power. But Allah's attributes are absolute and complete and infinite. Human beings cannot acquire His attributes to that extent. But

a momin acquires the color of Allah by imbibing His attributes in his character within human limitation. Remember! To the extent these attributes a person keeps imbibing in his character to the same extent he will continue to become momin. And in a society, in a system, and in a state, if these attributes of Allah take hold and reflect the color of Allah then only that society, that system, and only that state will *be* called Islamic. Then only that state will *be* called the Qur'anic state.

Dear friends! We have completed up to verse 14. We will continue from verse 15 in the next dars.

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت بزمِ طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	160/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	325/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ النمل	(27)	280	225/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	350/-	سورہ القصص	(28)	334	250/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	350/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	275/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	350/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	325/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	325/-
سورہ النحل	(16)	334	250/-	سورہ یٰس	(36)	164	125/-
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	275/-	سورہ الصفٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورۃ الکھف وسورہ مریم	(18-19)	532	325/-	سورۃ مومن حٰم سجدۃ، سورہ شوریٰ	(42,41,40)	624	550/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	275/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	325/-
سورۃ الانبیاء	(21)	336	225/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	325/-
سورۃ الحج	(22)	380	275/-				
سورۃ المؤمنون	(23)	408	300/-				
سورۃ النور	(24)	264	200/-				
سورۃ الفرقان	(25)	389	275/-				

ملنے کا پتہ: ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)، 25/B، گلبرگ 2، لاہور، فون نمبر: 4546 3571-42-92+

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔